مطالعۂ قرآن

مولانا وحید الدین خاں

❀❀❀ توجہ فرمائیں! ❀❀❀

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب..........

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد اَپ لوڈ (UPLOAD) کی جاتی ہیں۔
- متعلقہ ناشرین کی اجازت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات کی نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

❀❀❀ تنبیہ ❀❀❀

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر
تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں

ٹیم کتاب وسنت ڈاٹ کام

webmaster@kitabosunnat.com

www.KitaboSunnat.com

مطالعۂ قرآن

آیات قرآنی کا تذکیری مطالعہ

مولانا وحید الدین خاں
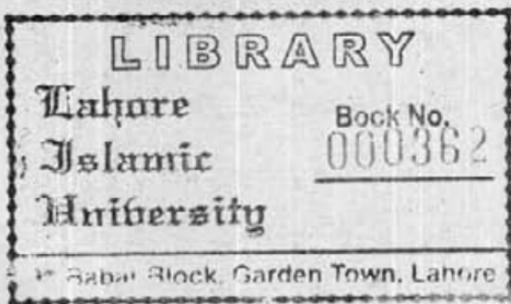
مطالعہ قرآن

ایک آسمانی کتاب کا کسی انسان پر اترنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ قدیم عرب میں یہ غیر معمولی واقعہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ جبریئل کے ذریعہ قرآن کو مکہ کے محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے اوپر اتارا۔ قرآن کا یہ نزول تقریباً تیئس سال میں پورا ہوا۔ اس کا ابتدائی حصہ ۶۱۰ء میں مکہ میں اترا اور اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں مدینہ میں نازل ہوا۔

دلائل قرآن

یہ قرآن کس طرح پیغمبر اسلام پر اترا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين، بلسان عربي مبين، وإنه لفي زبر الاولين، (الشعراء ۱۹۲۔۱۹۶) یعنی اور بے شک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے بنو۔ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔

نزول وحی (روح) کی مزید تفصیلات حدیث میں آئی ہیں۔ وحی کی حقیقت کے بارے میں عرب میں سوال کیا گیا تو قرآن میں اس کا جواب اس طرح دیا گیا: ويسئلونك عن الروح، قل الروح من أمر ربي و مااوتيتم من العلم الا قليلاً ہ (بنی اسرائیل ۸۵) یعنی اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے سلسلے میں اصل مسئلہ اس کا براہ راست جواب دینے کا نہیں ہے بلکہ خود سائل کی اپنی محدودیت کا ہے۔ کیوں کہ سائل اپنی فطری محدودیت کی بنا پر اس مسئلہ کو صرف جزئی طور پر ہی سمجھ سکتا ہے، وہ کلی معنی میں اس کی نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ جواب عین سائنٹفک ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں کے مطالعہ کے لئے سائنس میں عین یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ خود سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر کسی علم کا کلی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے سائنس میں جزئی واقفیت ہی کی بنیاد پر تمام نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ یہی

سائنسی طریقہ وحی کے بارے میں بھی انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔

قرآن خدا کا کلام ہے، وہ پیغمبر اسلام کا اپنا کلام نہیں۔ اس کا ایک سادہ ثبوت قرآن و حدیث کی زبان کا فرق ہے۔ حدیث خود پیغمبر اسلام کا اپنا کلام ہے اور قرآن وہ خدائی کلام ہے جو فرشتہ کے ذریعہ پیغمبر کے اوپر اترا۔ جب دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کے درمیان واضح اور نمایاں فرق ہے۔ حدیث اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک "بشر" کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے غیر معمولی اسلوب کی بنا پر ایک برتر شاہانہ کلام دکھائی دیتا ہے۔ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کا یہ فرق اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ کوئی بھی عربی داں جو دونوں کو تقابلی طور پر پڑھے، وہ اس فرق کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں کا یہ فرق اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ خود رسول کا اپنا کلام۔

دوسری چیز یہ کہ قرآن کے کلام میں معنوی اعتبار سے ایسے مختلف استثنائی پہلو ہیں جو کسی بھی انسان کے کلام میں پائے نہیں جاتے۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، اور تاریخ، وغیرہ کے بارے میں ایسے بیانات ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کسی بھی انسان کو معلوم نہ تھے جب کہ قرآن نازل ہوا۔ یہ حقائق پہلی بار صرف انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان کے علم میں آئے۔ ان حوالوں کا استثنائی طور پر قرآن میں موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کا کلام ہے۔ کوئی انسان اس قسم کی پیشگی اطلاع پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اس نوعیت کی بہت سی مثالیں راقم الحروف نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، عظمتِ قرآن، مذہب اور جدید چیلنج کا متعلق حصہ۔ اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں بھی بعض آیات کی تشریح کے تحت راقم الحروف نے اس طرح کے کچھ حوالے شامل کئے ہیں۔

فرانس کے ڈاکٹر مورس بکائی (Maurice Bucaille) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہے۔ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا ہے۔ عربی ترجمہ کا نام یہ ہے: القرآن الکریم والتوراۃ والانجیل والعلم (صفحات ۲۹۰) انگریزی ترجمہ کا ٹائٹل یہ ہے:

The Bible The Qur'an and Science.

اس کتاب میں قرآن کے قدیم بیانات کا تقابل جدید سائنسی دریافتوں سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان استثنائی طور پر کامل مطابقت کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کو خدا کا کلام مانا جائے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مصنف نے آخر میں لکھا ہے کہ ـــــ

In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconcevable that many of the statements in the Qur'an which are connected with science could have been the work of a man. It is, more over, perfectly legitimate, not only to regard the Qur'an as the expression of a Revelation but also to award it a very spacial place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presencein it of scientific statements which, when studied today, appear as challenge to explanation in human terms.

جمع و تدوین

قرآن پرنٹنگ پریس سے پہلے کے زمانہ میں نازل ہوا۔ مگر اس کی حفاظت کے لئے غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب وحی رہتا تھا تاکہ جب بھی جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر اتریں تو فوراً اس کو لکھ لیا جائے۔ یہ کتاب اس زمانے کے مستعمل کاغذوں پر ہوتی تھی۔ مثلاً جھلی وغیرہ۔ کتابت کا یہ اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ ہجرت کے موقع پر پیغمبر اسلام اپنے صحابی ابو بکر صدیق کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اگرچہ یہ انتہائی ہنگامی سفر تھا لیکن اس کے باوجود حضرت ابو بکر صدیق جو ایک کاتب وحی بھی تھے، اپنے ساتھ کاغذ اور قلم بھی لئے ہوئے تھے تاکہ سفر کے دوران اگر قرآن کا کوئی حصہ اترے تو اس کو فوراً لکھ لیا جائے۔

قرآن کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام بیک وقت دو طریقوں سے جاری تھا۔ ایک، نزول کے بعد فوراً اس کو لکھ لینا۔ دوسرے، اس کو باقاعدہ یاد کر لینا۔ اس طرح ایک طرف تقریباً دو درجن کاتب

وحی کتابت کے عمل میں مصروف رہتے تھے۔ اور دوسری طرف ہزاروں کی تعداد میں آپ کے ایسے اصحاب تھے جو قرآن کو لفظ بلفظ یاد کر لیتے تھے۔ واضح ہو کہ دور پریس سے پہلے دنیا بھر میں چیزوں کو یاد رکھنے کا رواج تھا اس لئے کثرت استعمال کی بنا پر اس زمانہ کے لوگوں کے حافظے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم عرب میں ایسے ہزاروں لوگ تھے جن کو لمبے لمبے نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے زبانی یاد تھے۔ اور وہ ان کو اپنے حافظہ کی مدد سے مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔

اس طرح قرآن حسب موقع اترتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں جب کہ قرآن کے تمام حصے اتر چکے تھے، خدا کے حکم سے جبرئیل آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے قرآن کے تمام نازل شدہ حصوں کو موجودہ مصحف کے مطابق ترتیب دیا۔ اور پھر مکمل قرآن سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اور پھر اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو اسی طرح سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اس طرح جبرئیل کے سامنے مکمل قرآن پڑھنے کا واقعہ دوبار ہوا۔ پہلے کو عرضہ اولیٰ کہا جاتا ہے اور دوسری بار پڑھے جانے کو عرضہ اخیرہ۔

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات ہوئی تو اس وقت قرآن ہر اعتبار سے محفوظ اور مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ وہ ایک مجلد کتاب کی صورت میں اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ یہ آخری کام خلیفہ اول ابو بکر صدیق کی ہدایت کے تحت انجام پایا۔ خلیفہ اول نے اس مقصد کے لئے زید بن ثابت انصاری کو مقرر کیا جو اس خاص کام کے لئے صحابہ میں سب سے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت نے اس کام کے لئے وہ آخری اہتمام کیا جو کسی انسان کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ لوگوں کے پاس قرآن کے لکھے ہوئے جتنے اجزاء ہیں وہ سب کے سب لائے جائیں۔ چنانچہ سب کے سب کتابت شدہ اجزاء حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دئے گئے۔ وہ خود قرآن کے مکمل حافظ تھے۔ تاہم انہوں نے مزید احتیاط کے لئے کچھ اور حفاظ کو اپنی مدد کے لئے مقرر کیا۔

اب وہ عمل شروع ہوا جس کو ایک مستشرق نے بجا طور پر چیکنگ کا دہرا طریقہ (-dub

ble checking system) کا نام دیا ہے۔ یعنی ایک طرف قاری قرآن کے حصے پڑھتا تھا اور دوسری طرف اس پڑھے ہوئے حصے کی مطابقت تحریری ذخیرہ سے کی جاتی تھی۔ اور جب تحریر اور حافظہ دونوں ایک دوسرے کے مطابق ثابت ہو جاتے تھے تو اس کو اس زمانہ کے دستیاب کاغذ پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح دہرا چیکنگ کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے پورے قرآن کو از اول تا آخر ترتیب کے اس زمانہ کے قابل حصول کاغذ پر لکھا گیا۔ اور پھر اس کی سلائی کر کے اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت دی گئی۔ چونکہ پہلا مصحف چوکور تھا اس لئے وہ ربعہ کہا جانے لگا۔

اس ربعہ (مصحف اول) کو خلیفہ ابو بکر صدیق نے رسول ﷺ کی زوجہ حضرت حفصہ بن عمر کے پاس رکھوا دیا۔ یہ مصحف اول اسی حالت میں حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس مصحفِ اول کو حضرت حفصہ کے پاس سے منگوایا اور سرکاری اہتمام کے تحت اس کے متعدد نقلیں تیار کرائیں۔ اور پھر ان تیار شدہ سرکاری نسخوں کو مسلم دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دیا اور یہ حکم دیا کہ یہ مصاحف شہر کی جامع مسجدوں میں رکھے جائیں تاکہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے بعد ہر شہر میں لوگ ان مصاحف کی مزید نقلیں تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قرآن کے ہزاروں صحیح نسخے ایشیاء سے لے کر افریقہ تک ہر ملک میں پھیل گئے۔

قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی یہ تاریخ آگے بڑھتی رہی۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے نسل در نسل لوگ حصہ لیتے رہے۔ مثال کے طور پر بنوامیہ کے حاکم حجاج بن یوسف الثقفی (وفات ۹۵ھ / ۷۱۴ء) کے زمانے تک قرآن میں اعراب نہیں ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے غیر عالم اس کو پڑھنے میں غلطی کرتا تھا۔ حجاج نے یہ کیا کہ پورے قرآن پر اعراب لگوائے۔ اس کے نتیجہ میں یہ امکان ختم ہو گیا کہ کوئی شخص قرآن کو پڑھنے میں ادائیگی کی غلطی کرے۔

اسی طرح قرآن کے قدیم نسخے ابتدائی خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس خط کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ اس میں موجودہ تحریری حسن موجود نہ تھا۔ اس کمی کو عباسی دور کے خطاط ابن مقلہ (وفات ۹۴۰ء) نے پورا کیا۔ ابن مقلہ خطاطی کا خصوصی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے لمبی مدت کے مشق اور تجربہ

کے بعد وہ خوبصورت عربی خط ایجاد کیا جس کو خطِ کوفی کہا جاتا ہے۔ موجودہ عربی خط اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس طرح ابن مقلہ کی کوششوں نے قرآن کو حسن خط کے دور میں داخل کر دیا۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل مسلسل صدیوں تک جاری رہا۔ کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کی نقلیں تیار کرتے اور اسی طرح کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کو حفظ کرتے۔ کتابت اور حفظ کو ایک دوسرے سے چیک کرنے کا عمل بھی صدیوں تک جاری رہا۔ جب بھی کوئی شخص قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر تیار کرتا تو کسی حافظ کو پڑھوا کر وہ اس کو چیک کرتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص قرآن کا حفظ کرتا تو اس کے حفظ کو لکھے ہوئے قرآن سے چیک کیا جاتا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ کچھ لوگوں نے فن قرأت ایجاد کیا۔ اس کے بعد ہر نسل میں ہزاروں لوگ اس عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کے لہجہ اور قرأت کو اس کی سابقہ حالت میں محفوظ رکھیں۔

یہ حفاظت قرأت کا یہ اہتمام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ آج جب ایک تربیت یافتہ قاری قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو سننے والوں کو ایسا محوس ہوتا ہے جیسے کہ وہ رسول اور اصحاب رسول کی قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس طرح رسول اور اصحاب رسول کی قرأت تاریخ کے دوش پر سوار ہو کر نسل در نسل سفر کرتی رہی تاکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو اس کی گونج اپنی اصل آواز میں سنائی دیتی رہے۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ وہ پرنٹنگ پریس اور رکارڈنگ کے دور میں پہنچ گیا۔ پرنٹنگ کی ایجاد نے قرآن کی کتابت کو ابدی طور پر محفوظ کر دیا۔ اسی طرح ریکارڈنگ کی ایجاد قرآن کی اصل آواز کی حفاظت کی یقینی ضمانت بن گئی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی انسانی حفاظت کے ساتھ اب اس کی پشت پر مشینی حفاظت کا اہتمام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس اہتمامِ مزید نے اب متنِ قرآن میں کسی بھی قسم کے بگاڑ کو عملاً ناممکن بنا دیا ہے۔

عربی زبان

قرآن کی حفاظت کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ قرآن کی زبان عربی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ یہ کام بھی امت کے علماء نے بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ عربی زبان قرآن کے نزول کے وقت ہی ایک اعلیٰ زبان کی حیثیت رکھتی تھی تاہم فنی اعتبار سے اس کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔

اس سلسلہ میں بہت سے لوگ اٹھے جنھوں نے نحو اور صرف اور لغت کے میدان میں غیر معمولی کام کیا۔ اور عربی زبان کو ایک مدون لغت کی حیثیت دے دی۔ قرآن کی زبان عربی کی حفاظت کا یہ کام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ عربی زبان استثنائی طور پر آج بھی اسی ابتدائی حالت میں زندہ ہے جیسا کہ وہ قرآن کے نزول کے وقت تھی۔ چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود اس کے اندر کوئی لغوی تبدیلی نہ ہو سکی۔ جب کہ اس مدت میں دنیا کی تمام زبانیں بالکل بدل چکی ہیں۔

مثال کے طور پر جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) انگریزی زبان کا مشہور شاعر ہے۔ چاسر ۱۳۴۲ء میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۰ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا زمانہ آج سے پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ لیکن اس کی زبان موجودہ انگلش زبان سے اتنا زیادہ مختلف ہے کہ آج کا کوئی عام انگریزی داں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو صرف ڈکشنری اور مخصوص ماہرین کی شرح کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن کی زبان عربی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج لکھی جانے والی عربی زبان عین وہی ہے جو نزول قرآن کے زمانے میں تھی۔ قرآن اور حدیث اور صحابہ کی زبان کو سمجھنا آج کے ایک عربی داں کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک عربی داں کے لئے ممکن اور آسان تھا۔

عربی زبان کا اس طرح استثنائی طور پر اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی اور زندہ رہنا محض اتفاقا نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہزاروں لوگ حفاظتِ زبان کے اس عمل میں لگے رہے۔ انھوں نے نحو اور صرف اور لغت اور دوسرے متعلق فنون میں غیر معمولی محنتیں کیں یہاں تک کہ ایک غیر مدون زبان کامل معنوں میں ایک مدون علمی زبان بن گئی۔ قرآنی زبان کو محفوظ کرنے کی یہ محنت کتنے بڑے پیمانہ پر کی گئی، اس کی صرف ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ابو سعید الاصمعی ایک مشہور لغوی تھا۔ وہ ۱۲۲ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا اور بصرہ ہی میں ۲۱۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ الاصمعی کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ عربی الفاظ کے وہ معانی دریافت کرے جو اصلی عرب باشندوں کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ لمبی مدت تک عرب کے صحراؤں میں گھومتا رہا تاکہ عرب بدوؤں سے عربی کے بارے میں لسانی معلومات حاصل کرے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عرب

بدوؤں میں عربی زبان اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔

قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: فدمدم علیهم ربهم بذنبهم فسواها (الشمس ۱۴) الاصمعی کو یہ فکر ہوئی کہ خالص عرب کس خاص مفہوم میں اور کس خاص موقع پر "دمدم" کا لفظ بولتے ہیں۔ اس دھن میں وہ عرب کے ایک بدو قبیلہ کے پاس گیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو سے پوچھتا کہ تم لوگ دمدم کا لفظ کس معنیٰ میں بولتے ہو مگر اس نے اس پر قناعت نہیں کی۔ اس نے چاہا کہ کوئی ایسا موقع آئے جب کہ ایک بدو بے ساختہ طور پر خود سے دمدم کا لفظ بول پڑے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک خانہ بدوش بدو خاندان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

تقریباً چھ مہینے گزر گئے لیکن بدو کی زبان سے دمدم کا لفظ اسے سنائی نہیں دیا۔ آخر کار ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مقام پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور وہاں دن کے کھانے کے لئے سالن پک رہا تھا۔ بدو مرد خیمے کے اندر تھا اور اس کی عورت باہر کچھ کام کر رہی تھی۔ الاصمعی بدو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سالن پکتے پکتے جب وہ لمحہ آیا کہ اس کی حرارت سوڈگری پر پہنچ گئی اور برتن کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن بھاپ کی جوش سے اُبل پڑا تو بدو نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دیتے ہوئے کہا: دمدمت۔ یہ سنتے ہی الاصمعی خیمے سے نکل کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ:

واللہ وجدتُ واللہ وجدتُ "خدا کی قسم میں پا گیا خدا کی قسم میں پا گیا۔"

اس طرح کئی سو سال تک ہزاروں اہلِ علم محنت کرتے رہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے عربی زبان کی حفاظت اور تدوین میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح قرآن اپنی اصل حالت میں کامل طور پر محفوظ ہے اسی طرح اس کی زبان عربی بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی نادر استثناء ہے، اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج قرآن کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے اسی طرح ناممکن ہو جاتا جس طرح دوسری مذہبی کتابوں کے ابتدائی نسخوں کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ دوسری تمام مذہبی کتابیں ترجموں کی مدد سے پڑھی جاتی ہیں۔ جب کہ قرآن کا مطالعہ آج بھی اس کی اصل زبان میں کیا جاتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں: کتاب انزلنه الیك مبارك لیدبروا آیته ولیتذکر اولوا الالباب (صٓ ۲۹) یعنی یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کو پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر اس کی قرأت کرنا۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آیتوں میں غور و فکر کر کے اس کو پڑھا جائے۔ قرآن کی قرأت سے ایک شخص کو اس کے سادہ معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا بھی بلاشبہ مفید ہے۔ لیکن قرآن کے گہرے معانی صرف اس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب کہ اس کی آیتوں پر غور و فکر کیا جائے۔ ایک صحابی کے متعلق، روایت میں آیا ہے کہ انہوں نے سورہ البقرہ کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا تو اس میں انھیں تین سال کا وقت لگ گیا۔

قرآن کی سادہ قرأت کیا ہے، اس کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر آدمی جو عربی زبان جانتا ہے وہ سادہ قرأت کے ذریعہ قرآن کے معانی کو سمجھ سکتا ہے اور جو شخص عربی زبان نہیں جانتا وہ اپنی معلوم زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے قرآن ایک آسان کتاب ہے (القمر ۱۷) جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا ذہن ہو اور وہ نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ ہو تو قرآن کی سادہ قرأت یا اس کا ترجمہ پڑھنا بھی اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ وہ سادہ قرأت کے ذریعہ بھی ایسی تذکیری باتیں پالے گا جو اس کی زندگی کو سدھارنے والی ہوں اور اس کے لئے اسلامی زندگی گزارنے میں مددگار بن جائیں۔

لیکن قرآن میں تدبر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سادہ قرأت اور تدبر کے ساتھ قرأت کے فرق کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "أنزل القرآن علی سبعة احرف، لکل آیة منها ظهر وبطن، ولکل حد مطلع" (مشکاۃ المصابیح ۱/۸۰) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ اور ہر حد کا ایک مطلع ہے۔

مطلع عربی زبان میں دیکھنے یا جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں اگر آپ زمین پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چیزوں کو دیکھ رہے ہوں تو آپ کی حد نظر کم ہو گی اور آپ بہت تھوڑی چیزوں کو دیکھ پائیں گے۔ لیکن اگر آپ ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کی بالائی چھت پر کھڑے ہوں تو بلند مطلع کی وجہ سے آپ کی حد نظر بہت بڑھ جائے گی۔ اور آپ زیادہ دور تک کی چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

اس حدیث میں مطلع کے فرق کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ قرآن کو اس کے ظاہری الفاظ کے اعتبار سے پڑھنے میں اور اس کے معنی پر غور کر کے پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جو آدمی صرف ظاہری الفاظ کے دائرے میں قرآن کو پڑھ رہا ہو وہ گویا نیچے کے مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا آدمی قرآن کے صرف سادہ مفہوم تک پہنچ سکے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی معانی پر غور کرتے ہوئے قرآن کو پڑھے وہ گویا بلند مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دوسرا آدمی قرآن کی گہرائیوں تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کے مطالعہ کی ان دو مختلف قسموں کو علمی زبان میں اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ایک قرآن کی سطور (lines) کا مطالعہ ہے اور دوسرا قرآن کے بین السطور (between the lines) کا مطالعہ۔ مطالعہ کی ان دونوں قسموں میں جو فرق ہے اس کو اہل علم بخوبی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن کے سطور کو پڑھنا اور قرآن کے بین السطور کا مطالعہ کرنا، دونوں میں جو فرق ہے اس کو یہاں مثال کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو وہاں ایسا ہوا کہ آپ کی مجلس میں بعض لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ یہ اسلامی آداب کے خلاف تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی ممانعت کے لئے یہ آیت اتری:

اے ایمان والو، تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط (برباد) ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے

ہیں وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود ان کے پاس نکل کر آجاؤ تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات ۲-۵)

قرآن کی ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر محض الفاظ کی سطح پر پڑھے گا وہ اس کے ظاہری مفہوم کو لے کر اس سے صرف ذاتی تقدس کا مسئلہ نکالے گا۔ وہ سمجھے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت زیادہ مقدس تھی اس لئے جو لوگ آپ کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تقدس اور احترام کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے پاس بیٹھیں۔ ایسا آدمی صرف قدیم مدینہ کے کچھ لوگوں کو اس کا مخاطب سمجھے گا۔ خود اپنی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے اس کے نزدیک اس میں کوئی ہدایت نہ ہوگی۔

اس کے برعکس جو آدمی حکم کی معنویت پر غور کرے گا اور زیادہ گہرے مفہوم تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ ان آیتوں میں ایک عمومی اور ابدی مسئلہ دریافت کرلے گا۔ وہ سمجھے گا کہ زمانۂ رسالت میں اگر اس کا تعلق ذاتِ رسول سے تھا تو اب اس کا تعلق پیغام رسول سے ہو گیا ہے۔ جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی میں آپ کی آواز پر آواز بلند کرنا جائز نہیں تھا۔ اسی طرح آج یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی آدمی پیغمبر اسلام کی دی ہوئی تعلیمات کے خلاف غیر ضروری بحثیں نکالے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

ایسے آدمی کو آیتوں کا پورا مطالعہ بتائے گا کہ ان آیات میں جس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کی ایک روش وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ اور صبر کے مطابق ہے۔ اور دوسری روش وہ ہے جو نفاق اور بے خوفی اور بے صبری کی علامت ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر لحہ اپنا احتساب کرے۔ وہ اپنے اندر ایمان والی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور نفاق والی صفتوں سے اپنے آپ کو آخری حد تک بچائے۔

اس معاملہ کی ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا

قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ لینے کے لئے ان کے پاس مصر میں آئے جب ان کو غلہ دیا جا چکا تو اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پھر جب ان کا سامان تیار کرادیا تو اس نے پینے کا پیالہ (سقایہ) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو، تم لوگ چور ہو، انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم شاہی پیمانہ (صواع) نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لئے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے۔ انھوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم سے بالاتر ایک علم والا ہے (یوسف ۷۰۔۷۶)

ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر صرف الفاظ کی سطح پر پڑھے وہ اس کا مطلب یہ سمجھے گا کہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ جب ان کا سگا بھائی بن یامین آیا تو انھوں نے چاہا کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیں۔ مگر وہ سوتیلے بھائیوں پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے حضرت یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامان میں شاہی دربار کا ایک برتن رکھوا دیا۔ اور اس کے بعد درباریوں کو اس میں شریک کر کے بن یامین کو چوری میں پکڑوا کر ان کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس قسم کا معاملہ بلاشبہ ایک پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن جو آدمی صرف لفظی سطح پر قرآن کا مطالعہ کرے وہ ان آیتوں کا یہی مطلب لے گا۔ لیکن جو آدمی قرآن کی سطور سے گزر کر بین السطور تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور گہرائی میں اتر کر اس کا مفہوم جاننا چاہے گا وہ مذکورہ تفسیر کے برعکس

ایک اور تفسیر تک پہنچ جائے گا جو پیغمبر کی شان کے عین مطابق ہے۔

ایسا آدمی جب قرآن کی ان آیتوں پر غور کرے گا تو اس کا ذہن ایک مقام پر پہنچ کر رک جائے گا۔ وہ دیکھے گا کہ شاہی دربار کے کارکن جو چیز تلاش کر رہے تھے وہ صواع (یوسف ۷۲) تھا جو عربی قاعدے کے مطابق مذکر ہے اور اس کے لئے ضمیر مذکر (ہ) آنا چاہئے۔ لیکن شاہی دربار کے کارکن اونٹوں کے سامان کی تلاشی لیتے ہیں تو سامان میں جو چیز ان کو ملتی ہے اس ملی ہوئی چیز کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) استعمال ہوئی ہے (۷۶)

اب غور کرنے والا آدمی جب ضمیر کے اس فرق کو دیکھے گا تو وہ پائے گا کہ معاملہ کی اصل تصویر اس سے بالکل مختلف ہے جو ظاہری الفاظ میں دکھائی دیتی تھی۔ اس سراغ کی روشنی میں جب وہ مزید غور کرے گا تو اس پر منکشف ہوگا کہ معاملہ کی اصل تصویر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو پہچان کر اپنا پانی پینے کا پیالہ (سقایہ) اس کے سامان میں رکھ دیا۔ سقایہ کا لفظ عربی قاعدے کے مطابق مؤنث ہے۔

دربار میں ناپ کے لئے ایک شاہی پیانہ (صواع) تھا جو غالباً چاندی کا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق صواع کا لفظ مذکر ہے۔ اتفاق سے یہ صواع غلہ کے ڈھیر میں دب کر کہیں چھپ گیا۔ یعنی وہی واقعہ ہوا جس کو انگریزی میں مس پلیس (misplace) ہونا کہتے ہیں۔ قافلے کے جانے کے بعد جب دربار کے کارکنوں نے صواع کو نہیں دیکھا تو ان کو قافلہ والوں پر شبہہ ہوا جو ابھی دربار سے نکلے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قافلہ والوں کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی میں صواع تو ان کے سامان سے برآمد نہیں ہوا البتہ سقایہ (پینے کا پیانہ) برآمد ہو گیا۔ یہ بات اس طرح سے معلوم ہوتی ہے کہ تلاشی کے دوران جو چیز برآمد ہوئی اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) آئی ہے۔ حالانکہ اگر صواع برآمد ہوتا تو اس کے لئے قرآن میں مذکر کی ضمیر (ہ) آنی چاہئے تھی۔

یہ سقایہ حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے سامان سے نکلا تھا کیوں کہ برادرانہ محبت کے تحت حضرت یوسف نے اس کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ہوا کہ دربار کے کارکنوں نے جب بن یامین کے سامان سے سقایہ نکالا تو انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم نے اگرچہ

صواع کی چوری تو نہیں کی ہے، لیکن تم نے ہمارے دربار کے ایک اور سامان سقایہ کو چرالیا ہے اس لئے خود تمہارے قانون کے مطابق ہم تمہارے بھائی کو روک لیں گے اور اس کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ بن یامین کو اپنے ساتھ لائے اور ان کو حضرت یوسف کے حوالے کردیا۔

قرآن فہمی کے لئے بہت سے علوم ضروری ہیں جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے فنی مطالعہ، اور دوسرا مطالعہ وہ ہے جو قرآن سے نصیحت لینے کے لئے کیا جائے۔ جہاں تک قرآن کے فنی مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں بہت سے علوم کی ضرورت ہو سکتی ہے، حتیٰ کہ ان علوم سے بھی زیادہ جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اگر اس حدیث کو سامنے رکھا جائے: لا تنقضی عجائبہ (قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے) تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان علوم کی فہرست ہر دور میں بڑھتی رہے گی اور وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔

مگر جہاں تک نصیحت کے مقصد سے قرآن کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کے لئے عربی زبان سے واقفیت کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تقویٰ اور خشیت ہے۔ اس کی تصدیق خود قرآن سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خود علوم ربانی کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہرا تقویٰ موجود ہو تو قرآن کے معانی کو سمجھنے میں وہ اپنے آپ آدمی کے لئے مکمل رہنما بن جائے گا۔

تقویٰ آدمی کے اندر سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی رائے قائم کرنے میں بے حد محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ حقیقتوں کو اللہ کی نظر سے دیکھنے کا حریص بن جاتا ہے نہ کہ محض اپنی نظر سے۔ وہ رائے قائم کرنے سے پہلے مطالعہ اور فکر کی تمام ممکن شرطوں کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیزیں آدمی کو اس قابل بنادیتی ہیں کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹکے بغیر قرآن کے معانی کا ادراک کر سکے۔

اسبابِ نزول کی روایات

قرآنی آیتوں کے سلسلہ میں اسباب نزول کی جو روایات ہیں وہ قرآن فہمی کے معاملہ میں

بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ ان سے مختلف احکام کے نزول کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ پس منظر کو جانے بغیر کسی کلام کو درست طور پر سمجھا نہیں جاسکتا۔

اس معاملہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ راقم الحروف کی تحریریں مسلسل طور پر انٹرنٹ پر آرہی ہیں۔ جون ۲۰۰۰ میں میرے کچھ مضامین انٹرنٹ پر آئے جن میں موجودہ مسلمانوں کو قرآن کی روشنی میں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ صبر واعراض کی روش اختیار کرتے ہوئے دعوت کا کام کریں۔ اس کے بعد مجھے ایک "مسلم مجاہد" کا انٹرنٹ پر شدید رد عمل ملا۔ انہوں نے غصہ کے انداز میں کہا تھا کہ دیکھو، یہ ہندستانی مولانا ہم سے کہتا ہے کہ تم لوگ صبر کرو۔ جب کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ تم لوگ جنگ کرو (فقاتلوا ائمة الکفر الخ)۔ التوبہ ۱۲۔۱۳

اس کے جواب میں میں نے مذکورہ مجاہد بھائی کو لکھا کہ میں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں لکھی ہیں بلکہ ان کے لئے خود قرآن کے حوالے دئے ہیں۔ پھر میں نے بتایا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے لکھا کہ آج جس طرح قرآن آپ کے ہاتھ میں ایک مجلد کتاب کی صورت میں ہے، اسی طرح اگر وہ اول دن سے موجود ہوتا تو یہی صورت حال غالباً دور اول میں بھی پیش آتی۔

چنانچہ مکہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے کہ اے مسلمانو، صبر کرو تو آپ جیسے کوئی صاحب قرآن کی ایک جلد لے کر کھڑے ہوتے اور کہتے کہ دیکھو، محمد ہم کو صبر کی نصیحت کر رہے ہیں اور قرآن صاف لفظوں میں کہہ رہا ہے کہ ظالموں سے جنگ کرو، (الحج ۳۹)۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حدیبیہ میں قریش کے مشرک لیڈروں سے صلح کر رہے تھے تو وہاں بھی کوئی صاحب مکمل قرآن اپنے ہاتھ میں لے کر کہتے کہ دیکھو، محمد ہم سے کہتے ہیں کہ کافروں سے صلح کرلو جب کہ قرآن برعکس طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ ان سے جنگ کرکے ان کا فتنہ ختم کرو۔ (الانفال ۳۹)

دور اول میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا پھر موجودہ زمانہ میں کیوں ایسا ہو رہا ہے۔ اس عجیب صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اور بعد کے زمانہ میں ایک بنیادی فرق

ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن نجماً نجماً ۲۳ سال کی مدت میں اترا۔ مکہ میں ابتداءِ رسالت سے لے کر مدینہ میں آپ کی وفات تک مختلف اور متنوع قسم کے حالات پیش آتے رہے۔ چنانچہ حالات کی نسبت سے اس وقت جو ہدایت مطلوب ہوتی وہ قرآن میں بروقت نازل کر دی جاتی۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی اس آیت میں کہی گئی ہے: **و قرآناً فرقنه لتقرأه علی الناس علی مکث ونزلنه تنزیلاً** (بنی اسرائیل ۱۰۶)

گویا دور اول میں یہ صورت حال تھی کہ جب اور جس وقت جو عمل مطلوب ہوتا اس سے مطابقت رکھنے والی آیت پیغمبر اسلام ﷺ کے پاس بھیج دی جاتی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس وقت نزول حکم اور اس کے عملی انطباق کے درمیان کوئی فرق یا فاصلہ موجود نہ تھا۔

مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ ۲۳ سال میں وقفہ وقفہ سے اتری ہوئی آیتیں اور سورتیں ایک واحد کتاب کی شکل میں مرتب کر کے بیک وقت اہل اسلام کو دے دی گئیں۔ اب یہی کامل نسخہ بعد کے مسلمانوں کے پاس ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ حکم اور انطباق کے درمیان فرق کے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا جائے۔

اسباب نزول یا شان نزول کی روایات اسی کا جواب ہیں۔ اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ اسباب نزول کی روشنی میں آیتوں کا مطالعہ کر کے اس مخصوص حالت یا پس منظر (background) کو دریافت کریں جو آیت کے ابتدائی نزول کے وقت مکہ اور مدینہ میں موجود تھا۔ اور پھر قدیم حالت اور موجودہ حالت کے درمیان مشابہت (similarity) کو دریافت کر کے یہ سمجھے کہ کس طرح کی صورت حال میں کون سی آیت قابل انطباق (applicable) ہے اور کون سی آیت قابل انطباق نہیں۔

اسی حکمت تشریع کی روشنی میں فقہ کا یہ اصول وضع ہوا ہے کہ **تتغیر الاحکام بتغیر الزمان والمکان**، یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ احکام کے انطباق کا تعین خود حالات کی نوعیت سے ہوتا ہے نہ کہ محض حکم کے الفاظ سے۔

یہ ایک بے حد اہم بات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریقہ درست نہیں کہ آدمی قرآن کی ایک آیت لے کر کہے کہ دیکھو قرآن میں یہ حکم موجود ہے اور ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔

اس کے بجائے یہ ہونا چاہئے کہ پہلے کسی وقت میں موجود صورت حال (given situation) کو بے لاگ طور پر سمجھا جائے اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ اس طرح کی صورت حال میں قرآن کا کون سا حکم قابل انطباق (applicable) ہے۔

خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے قرآن کی بعض آیتوں کو مطلق طور پر لے کر ان کے انطباق کا مطالبہ کیا جب کہ وہ آیتیں صورتِ موجودہ کے لئے نہ تھیں۔ ایسے لوگوں کے خلاف سخت تبصرہ کرتے ہوئے خلیفۂ چہارم نے کہا: کلمة حق ارید بھا الباطل۔ یعنی بظاہر یہ لوگ قرآن کی آیتوں کا حوالہ دے رہے ہیں مگر وہ ان آیتوں کو غلط جگہ چسپاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے بظاہر اگر چہ وہ کلمۂ حق پیش کر رہے ہیں مگر وہ سراسر باطل پر ہیں۔

معلوم ہوا کہ کسی عمل کے قرآنی ہونے کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اس کی حمایت میں آدمی نے ایک قرآنی آیت کو پا لیا ہو۔ بلکہ لازمی طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ آیت اسی خاص موقع کے لئے ہو جہاں اس کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ بصورت دیگر ایسا فعل ایک سرکشی ہوگا نہ کہ قرآن کا اتباع۔

فہم قرآن کی کلید

"فہم قرآن کی کلید کیا ہے"۔ اس سوال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جواب یہ ہے کہ قاری قرآن کی اس انقلابی اسکیم کو جانتا ہو جو قرآن کا اصل مقصود ہے۔ مگر یہ ایک ایسا جواب ہے جس کا ماخذ خود قرآن میں موجود نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محض اپنے ذاتی ذہن کے تحت اس سوال کا جواب متعین نہیں کیا جا سکتا۔ ہم قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں پاتے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ قرآن کو صرف وہ شخص سمجھے گا جو قرآن کی انقلابی اسکیم سے واقف ہو۔ ایسی حالت میں یہ جواب قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ وہ اس قابل ہے کہ پہلے مرحلہ ہی میں اس کو رد کر دیا جائے۔

اسی طرح کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ "نظم کلام" وہ کلید ہے جس کے ذریعہ ہم قرآن کو سمجھ سکتے ہیں۔ مگر یہ جواب بھی درست نہیں۔ کیوں کہ وہ بھی صرف ذاتی سوچ (reasoning) پر مبنی ہے۔ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں جو یہ اعلان کرتی ہو کہ نظم کلام کا سمجھنا قرآن فہمی کی کلید ہے۔ ایسی حالت میں اس کو بھی زیر غور نہیں لایا جا سکتا۔ یہ زیادہ سے زیادہ ایک استنباطی قرینہ ہے، وہ کوئی منصوص

قرینہ نہیں۔ اور اس اہم سوال کا جواب پانے کے لئے قرآنی نص درکار ہے نہ کہ کسی کا ذاتی استنباط۔

اس پہلو سے جب ہم قرآن کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں اس کا جواب نہایت واضح لفظوں میں موجود ہے۔ مثلاً قرآن کے آغاز ہی میں یہ آیت ہمیں ملتی ہے کہ: ذالك الكتاب لاريب فيه، هدى للمتقين۔ (البقرہ ۲) اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے رہنمائی لینے کے لئے جو اصل چیز مطلوب ہے وہ تقویٰ ہے۔ اسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا الله ويعلمكم الله (البقرہ ۲۸۲) اس آیت سے بھی واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ علم ربانی یا فہم قرآنی کی اصل کلید یہ ہے آدمی کے اندر تقویٰ کی صفت موجود ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کس طرح فہم قرآن کی کلید ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن جیسے کلام کو سمجھنے کے لئے اصل اہمیت یہ ہے کہ آدمی کے اندر سنجیدگی ہو۔ اس کے اندر کامل اعتراف کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ وہ ہر قسم کے تعصبات سے خالی ہو کر قرآن کا مطالعہ کرے۔ وہ قرآن کو خود قرآن کی نظر سے دیکھے نہ کہ کسی اور نظر سے۔ وہ پورے معنوں میں حق کا متلاشی ہو۔ وہ قرآن میں خود قرآن کی بات جاننے کی کوشش کرے نہ کہ خود اپنی بات کو قرآن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ کھلے ذہن کے تحت قرآن کا مطالعہ کرے نہ کہ متاثر ذہن (conditioned mind) کے تحت۔

حقیقی تقویٰ آدمی کے اندر یہی صفات پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ اس گہری اور ذہنی اور قلبی کیفیت کا نام ہے جو اس آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے جو اللہ کو اس کی عظمت و جلال کے ساتھ دریافت کرے۔ ایسا شخص انسان اصلی (man cut to size) بن جاتا ہے۔ اس کے اندر آخری حد تک فروتنی (modesty) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور بلاشبہ یہی وہ نفسیات ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ حقائق و معارف کا ادراک کر سکے۔ قرآن فہمی کی دوسری تمام شرائط کی حیثیت اضافی ہے اور اس متقیانہ مزاج یا ربانی نفسیات کی حیثیت اصلی۔

قرآن معرفتِ حق کی کتاب ہے۔ قرآن کا حقیقی مطالعہ وہ ہے جو اس کا عارفانہ مطالعہ ہو۔ فنی مطالعہ قرآن کا حقیقی مطالعہ نہیں۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب

زیر نظر مجموعہ (مطالعۂ قرآن) کی ترتیب یہ ہے کہ اس میں قرآن کی تمام کی تمام ۱۱۴ سورتوں سے کچھ نہ کچھ آیات لی گئی ہیں۔ آیات کے معاملہ میں انتخاب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مگر سورتوں کے معاملہ میں نہیں۔

مجموعی طور پر اس کتاب کے کل ۲۵۴ اجزاء ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے ہر جزء یا مضمون (item) کو اس طرح درج کیا گیا ہے کہ اس کے اوپر پہلے سورہ نمبر اور سلسلہ نمبر ہوتا ہے اور پھر اس کے نیچے زیر تشریح آیت کا عنوان۔ اسی کے ساتھ ہر حوالہ کا آیت نمبر بھی ترجمہ کے آخر میں درج کیا گیا ہے۔ اس طرح قاری کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے جس جزء کے بارے میں مزید تحقیق چاہے، فوراً اس کو قرآن میں یا تفسیر قرآن میں نکال لے۔

وحید الدین

نئی دہلی، ۱۷/ جولائی ۲۰۰۰

1-001

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جملہ قرآن میں ۱۱۴ بار آیا ہے۔ وہ سورۃ التوبہ کے سوا ہر سورہ کے آغاز میں موجود ہے، اور سورہ النمل (آیت ۳۰) میں ایک بار آیا ہے۔ اس غیر معمولی تکرار سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا مطلب ہے ـــــ میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

آدمی جب کسی کام کو شروع کرتا ہے تو وہ اس کو کسی نہ کسی بھروسہ پر شروع کرتا ہے۔ مثلاً ذہنی یا جسمانی طاقت، مال و دولت، اعوان و انصار، حالات و اسباب، وغیرہ۔ یہ سب کام شروع کرنے کے غیر مومنانہ طریقے ہیں۔ کسی کام کو شروع کرنے کا مومنانہ طریقہ یہ ہے کہ اس کو اللہ کے بھروسے پر شروع کیا جائے۔ آدمی جب کوئی کام شروع کرے تو اس کا سینہ ربانی جذبات سے بھرا ہوا ہو۔

بندے کے لئے کسی کام کا سب سے بہتر آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے کام کو اپنے رب کے نام سے شروع کرے۔ وہ ہستی جو تمام رحمتوں کا خزانہ ہے اور جس کی رحمتیں ہر وقت ابلتی رہتی ہیں۔ اس کے نام سے کسی کام کا آغاز کرنا گویا اس سے یہ دعا کرنا ہے کہ تو اپنی بے پایاں رحمتوں کے ساتھ میری مدد کے لئے آجا۔ اور میرے کام کو خیر و خوبی کے ساتھ مکمل کر دے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنی بندگی کا اعتراف ہے اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی کی الٰہی ضمانت بھی۔

قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ مومن کے قلبی احساسات کے لئے صحیح ترین الفاظ مہیا کرتا ہے۔ بسم اللہ اسی نوعیت کا ایک دعائیہ کلمہ ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **کل أمر ذی بال لم یبدأ فیه بسم الله الرحمن الرحیم اقطع**۔ (التفسیر المظہری، ۱/۲) یعنی ہر قابل اہتمام اُمر جس کو بسم اللہ الرحمین الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ مقطوع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی بھی کام صرف اس وقت اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے جب کہ اس کو خدائی نظام کی مساعدت

حاصل ہو جائے۔ کسی کام کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرنا گویا یہ کہنا ہے کہ خدایا میں نے اپنی کوشش سے ایک کام کا آغاز کیا ہے اب تو اپنی مدد سے اس کو آخری تکمیل تک پہنچا دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کوئی پر اسرار کلمہ نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان مخصوص حروف اور الفاظ میں کوئی طلسماتی تاثیر چھپی ہوئی ہے اور جب ایک شخص اس کو اپنی زبان سے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرتا ہے تو وہ پر اسرار طور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ بلکہ یہ الفاظ اس انسان کے اعلیٰ جذبات و کیفیات کی علامت ہیں جو خدا کو معرفت کے درجہ میں پائے ہوئے ہو۔ جس کا یقین ہو کہ خدا قادر مطلق ہے، اسی کی مدد سے ہوگا جو کچھ ہوگا، اس کی مدد کے بغیر اس دنیا میں کچھ بھی ہونے والا نہیں۔ یہ احساس جب لفظوں کی صورت میں ڈھل جائے تو اسی کا نام بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا ہے۔

اس کلمہ میں خاص طور پر اللہ کی صفت رحمت کا ذکر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کی نسبت سے اسی صفت کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اللہ کی یہی صفت ہے جس کی بنا پر آدمی اس کے اعلیٰ عطیات اور انعامات کا مستحق بنتا ہے۔ اللہ کا ہر چیز پر قادر ہونا اس کے ذاتی کمال کا مظہر ہے، اور اس کا رحمٰن و رحیم ہونا اس کا متقاضی ہے کہ وہ اپنی قدرت کے خزانوں میں انسان کو حصہ دار بنائے۔

انسان مکمل طور پر ایک عاجز مخلوق ہے۔ ایک خود شناس انسان جب بھی کسی عمل کا آغاز کرتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، تو اس وقت فطری طور پر اس کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی برتر ہستی ہو جو اس کے عجز کی تلافی کرے۔ جو کام وہ خود اپنی طاقت سے نہیں کر سکتا اس کو وہ اپنی برتر مدد کے ذریعہ مکمل کرے۔ یہی فطری احساس ہے جو ہر کام کے آغاز میں ایک خود شناس انسان کی زبان پر بار بار جاری ہوتا رہتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک جامع کلمہ ہے۔ وہ دعا بھی ہے اور ذکر بھی ہے، اور خدا کی عظمت اور اس کے مقابلے میں انسان کی عبدیت کی یاد دہانی بھی۔

1-002

حمد خداوندی

قرآن کی پہلی سورۃ کی پہلی آیت یہ ہے: الحمد للہ رب العالمین (الفاتحہ ۱) یعنی حمد سب کی سب صرف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہاں کا رب ہے۔ قرآن کی یہ آیت قرآن کی نسبت سے اس کی تعلیمات کا خلاصہ ہے، اور انسان کی نسبت سے اس کی فطرت کی بے ساختہ پکار۔

حمد کا لفظ اس لطیف احساس کے لئے بولا جاتا ہے جو آدمی کے اندر سے خدا کی تعریف اور اس کے شکر کے لئے فطری طور پر ابلتا ہے۔ آدمی کا اپنا وجود اور گردو پیش کی پوری کائنات ہر لمحہ اس کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ تمہارا اور کائنات کا خالق ایک انتہائی عظیم ہستی ہے اور تمہارے اوپر اس ہستی کے عظیم احسانات ہیں۔ یہ گہرا شعور جب آدمی کے اندر پیدا ہو اور اس کا بے تابانہ اعتراف اس کی زبان سے ابل پڑے تو اسی کا نام حمد ہے جو بیک وقت تعریف کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے اور شکر کا پہلو بھی۔

آدمی جب اپنے آپ پر غور کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو ایک ایسا وجود دیا گیا ہے جو حیرت ناک حد تک کامل اور بامعنی ہے۔ وہ جب اپنے پاؤں سے چلتا ہے اور اپنے ہاتھ سے پکڑتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہاتھ اور یہ پاؤں اس کے لئے اتنی بڑی نعمت ہیں کہ ان کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جب آنکھ سے دیکھتا ہے اور کان سے سنتا ہے تو اس کے اندر ایک ایسا پر ارتعاش جذبہ (thrill) پیدا ہوتا ہے جس کا اظہار لفظوں میں کیا جانا ممکن نہیں۔ وہ جب اپنے دماغ کو دیکھتا ہے اور اس کو استعمال کرتا ہے تو اس ناقابل بیان نعمت کے اعتراف میں اس کا سینہ جذبات سے بھر جاتا ہے۔ اسی قسم کی قلبی کیفیات کے لفظی اظہار کا نام حمد ہے۔

حمد ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ اور ہر وقت جاری رہتا ہے۔ وہ رات کو تھک کر بستر پر سو جاتا ہے اور صبح کو تازہ دم ہو کر اٹھتا ہے تو وہ خدا کی حمد میں سرشار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ دراصل خدا ہی تھا جس نے رات کے وقت اس پر نیند طاری کی اور صبح کے وقت اس کو جگا

دیا۔ اس کے بعد جب وہ زمین پر چلتا ہے تو یہ چلنا اس کو ایک معجزاتی حد تک قابل شکر واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ زمین پر انسان کا چلنا کوئی سادہ بات نہیں، بے شمار فوق الطبیعی اسباب یکجا ہوتے ہیں، اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسان جیسی ایک مخلوق زمین پر چلے۔ مثال کے طور پر اگر زمین کا سائز موجودہ سائز کا دگنا ہو تو اس کی بڑھی ہوئی کشش کی بنا پر انسان کا جسم اتنا زیادہ وزنی ہو جائے گا کہ زمین پر چلنا اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے وہ اپنے سر پر کئی ٹن کا بوجھ لادے ہوئے ہے۔ اسی طرح اگر زمین کا سائز موجودہ سائز کے مقابلے میں آدھا ہو جائے تو اس کی کشش گھٹ جانے کی وجہ سے انسان کا جسم اتنا زیادہ ہلکا ہو جائے گا کہ وہ زمین پر لڑکھڑانے لگے، اس کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ وہ قدم جما کر زمین پر چل سکے۔

اسی طرح آدمی جب سورج کی روشنی کو دیکھتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو وہ سورج کی تخلیق اور اس کے نظام میں پوشیدہ ان گنت حکمتوں کو سوچ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ سورج کی شکل میں وہ ایسی خدائی نعمت کو دیکھنے لگتا ہے جس کے اظہار سے اس کی زبان عاجز ہے۔ سورج کی شکل میں خدا نے انسان کو جو نعمت دی ہے اس کے انگنت پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر زمین کے مقابلے میں سورج کا فاصلہ بے حد موزوں ہے۔ اگر یہ فاصلہ کم ہو کر نصف ہو جائے تو زمین پر گرمی اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ اس کی گرمی میں انسان اس طرح جھلس اٹھے گا جیسے جلتے ہوئے توے پر ایک کاغذ رکھ دیا جائے۔ اس کے برعکس اگر زمین سے سورج کا فاصلہ موجودہ فاصلہ کا دگنا ہو جائے تو زمین کی سطح پر اتنی ٹھنڈک ہو گی کہ انسان اس کے اندر ٹھٹھر کر رہ جائے۔

اسی طرح آدمی جب ہوا میں سانس لیتا ہے تو وہ اس کی حکمتوں کو سوچ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ کس طرح یہ ممکن ہوا کہ مختلف گیسوں کا متناسب مجموعہ ہوا کی شکل اختیار کرے۔ اس میں مخصوص تناسب کے ساتھ آکسیجن موجود ہو اور اس کے ساتھ درختوں کے ذریعہ آکسیجن کی سپلائی مسلسل جاری ہو۔ اور پھر یہ ہوا آکسیجن کو لے کر ساری دنیا میں اس کی سپلائی کرے تاکہ کوئی انسان جہاں بھی ہو وہاں سانس لے کر زندہ رہ سکے۔ اسی کے ساتھ انسانی جسم کے اندر یہ

نظام کہ وہ باہر سے آکسیجن کو لے اور اندر سے کاربن ڈائی آکسائڈ کو خارج کرے ـــــ اس قسم کی باتیں دہشت ناک حد تک عجیب ہیں۔ جب ایک آدمی ان کا واقعی احساس کرتا ہے تو اس کی زبان سے بے ساختہ طور پر حمد و شکر کا سیلاب جاری ہو جاتا ہے۔

اسی طرح انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کو پانی اور خوراک کی ضرورت ہے اور پھر وہ پاتا ہے کہ صاف و ستھرا پانی، طرح طرح کی صحت بخش غذائیں زمین پر وافر مقدار میں موجود ہیں۔ انسان کو اپنا جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے اور زمین پر ایسی چیزیں کثیر مقدار میں رکھی گئی ہیں جن میں تصرف کر کے وہ انھیں کپڑے کی صورت دے سکے۔ انسان کو اپنے تمدن کی تعمیر کے لئے بہت سی مادی چیزیں درکار ہیں۔ یہاں وہ پاتا ہے کہ زمین کے اندر مختلف قسم کی معدنیات کا ذخیرہ بہت بڑی مقدار میں پیشگی طور پر رکھ دیا گیا ہے جن کو استعمال کر کے وہ اپنے لئے شاندار تمدنی زندگی کی تعمیر کرے۔

اسی طرح انسان کو زندگی کی بقا اور ترقی کے لئے بے شمار چیزوں کی ضرورت ہے۔ یہ تمام چیزیں موجودہ دنیا میں اس حالت میں ذخیرہ کر دی گئی ہیں کہ انسان انھیں با آسانی دریافت کر لے اور انھیں بڑے پیمانہ پر استعمال کر سکے۔ ان میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کو انسان نے جان لیا ہے اور وہ چیزیں بھی جن کو انسان نے ابھی تک نہیں جانا ہے۔

یہی علم اور شعور وہ چیز ہے جس کا ادراک آدمی کے اندر وہ جذبات پیدا کرتا ہے جس کو قرآن میں حمد کہا گیا ہے۔ خدا کی نعمتوں کا یہ شعور آدمی کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ وہ خدا کو یاد کرنے والا بن جاتا ہے۔ وہ غیب میں خدا کا اس طرح ادراک کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو۔

2-003

کتاب لاریب

قرآن کی پہلی سورۃ الفاتحہ گویا کہ قرآن کا دیباچہ ہے۔ اس مختصر سورۃ کے فوراً بعد سورہ البقرہ ہے۔ اس سورہ کا پہلا جملہ یہ ہے: ذالك الكتب لاريب فيه (البقرہ ٢) یعنی یہ کتاب ایسی

ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس آیت میں الکتب سے مراد قرآن ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، قرآن قیامت تک کے لئے ہے۔ اس لئے اس قرآنی بیان کا تعلق ان تمام زمانوں سے ہے جو قیامت تک انسان کے اوپر گزریں گے۔

اس طرح یہ قرآنی بیان گویا کہ ایک ابدی چیلنج ہے۔ اس میں قرآن کی بابت اس یقینی مستقبل کا اعلان کیا گیا ہے کہ کبھی بھی کوئی فرد یا گروہ اس میں شک نہ ڈال سکے گا، یہ کتاب انسانی تاریخ کے آخری مرحلے تک ہر قسم کے شک وشبہہ سے پاک رہے گی۔

یہ استثنائی حد تک ایک ایسا انوکھا کلام ہے جس کی نظیر کسی بھی دوسری مذہبی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بائبل میں جن باتوں کو رسولوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے ان کے بارے میں اہل علم نے اس شک کا اظہار کیا ہے کہ تاریخی طور پر ان باتوں کا انتساب مذکورہ رسولوں سے ثابت شدہ نہیں۔ اسی طرح ہندوازم کی مذہبی کتاب بھاگوت گیتا کے بارے میں اہل علم نے یہ شبہہ ظاہر کیا ہے کہ وہ فی الواقع میدانِ جنگ کا کلام ہے جو کرشن نے ارجن سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ یا وہ بہت بعد کو رامائن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح گوتم بدھ سے جس کلام کو منسوب کیا جاتا ہے اس کے بارے میں اہل علم کو یہ شک ہے کہ وہ موجودہ ریکارڈ کے مطابق پالی یا سنسکرت میں تھا یا کسی اور زبان میں، وغیرہ۔

مگر جہاں تک قرآن کا معاملہ ہے، وہ اس قسم کے شک سے مکمل طور پر پاک ہے۔ اس کے نزول کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں اس کے باوجود آج تک کوئی صاحب علم اس میں اس شک کی گنجائش نہ پا سکا کہ یہ وہی عربی کلام ہے جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں خدائی کلام کے طور پر پیش کیا تھا۔ آج بھی پورا قرآن اپنی اصل ابتدائی حیثیت میں ہے اور عین اسی زبان میں موجود ہے جیسا کہ وہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

اسی طرح شک کے دوسرے جتنے پہلو ہیں، ان سب کے اعتبار سے قرآن اپنی غیر مشتبہ حیثیت کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ قرآن میں بہت سے ایسے حوالے ہیں جو انسانی علوم سے

تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حیاتیات، نباتات، ارضیات، فلکیات، معدنیات، معاشیات، اور تاریخ، وغیرہ۔ یہ علوم نزولِ قرآن کے وقت اپنی ابتدائی حالت میں تھے۔ بعد کو ان میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ موجودہ زمانے میں یہ تمام علوم اتنا زیادہ ترقی کر گئے جو نزول قرآن کے زمانے میں ناقابلِ قیاس تھا۔

مگر یہ حیرت انگیز بات ہے کہ بعد کے زمانے کی علمی ترقیاں قرآن کے کسی بھی بیان کو مشکوک ثابت نہ کر سکیں۔ قرآن کا ہر بیان اپنی صداقت کو بدستور برقرار رکھے ہوئے ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کی ایک آیت ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ (الانبیاء ۳۰) قرآن کی اس آیت میں جس کائناتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ نزول قرآن کے وقت سراسر غیر معلوم تھی، حتی کہ بعد کی صدیوں میں جب کہ قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں تو ان تفسیروں میں بھی اس کی کوئی واضح تشریح نہ کی جا سکی۔ موجودہ زمانے میں علمی ترقی کے بعد اگر بالفرض یہ معلوم ہوتا کہ زمین و آسمان (یا ستارے اور سیارے) اب جس طرح لامحدود خلا میں پھیلے ہوئے ہیں اسی طرح وہ اپنی ابتدا سے ہیں تو کسی کو قرآن کے مذکورہ بیان پر شک کے اظہار کا موقع مل سکتا تھا۔ لیکن بعد کی علمی ترقیوں نے حیرت انگیز طور پر یہ ثابت کیا کہ زمین و آسمان ابتداء میں ایک سپر ایٹم کی صورت میں جڑے ہوئے تھے اس کے بعد اس کے اندر ایک دھماکہ ہوا جس کے نتیجہ میں موجودہ پھیلتی ہوئی کائنات وجود میں آئی۔

یہی معاملہ علم انسانی کے تمام دوسرے شعبوں کا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کے ایک تاریخی بیان کو لیجیے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کے ہم عصر فرعون کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ غرق ہونے لگا تو خدا نے اس سے کہا: الیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة (یونس ۹۲) یعنی آج ہم تیرے بدن کو بچائیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی بنے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ غرق شدہ فرعون کا جسم بدستور محفوظ ہے تاکہ وہ بعد والوں کے

لئے نشانی بنے۔ مگر نزول قرآن کے وقت یہ واقعہ سراسر غیر معلوم تھا۔ حتی کہ بعد کی صدیوں میں جب کہ قرآن کی تفسیریں کی گئیں، ان میں بھی مفسرین اس کی کوئی واضح تفسیر نہ کر سکے۔ اب اگر ماضی کی طرح بعد کے زمانہ میں بھی فرعونِ موسیٰ کا جسم غیر معلوم رہتا تو کسی کو یہ موقع مل سکتا تھا کہ وہ قرآن کے اس بیان پر شک ظاہر کرے۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی نے اس شک سے پردہ اٹھایا اور اس نے قرآن کے اس بیان کی صداقت ثابت کر دی۔

انیسویں صدی کے آخر میں ایک یورپین اسکالر نے مصر کی ایک قدیم عمارت سے مومیائی کی ہوئی ایک لاش نکالی۔ یہ لاش اب قاہرہ کے میوزیم میں شیشہ کے کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں اس لاش پر مختلف قسم کی تحقیق کی گئی۔ اسی کے ساتھ جدید سائنسی طریقہ کے مطابق اس کی عمر معلوم کی گئی۔ یہاں تک کہ یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لاش اسی فرعون کی ہے جو موسیٰ کے زمانہ میں اپنے لشکر کے ساتھ غرق ہوا تھا۔

اسی طرح جس پہلو سے بھی قرآن کا جائزہ لیا جائے وہ ایک ایسی کتاب ثابت ہوتا ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن کی پوری تاریخ غیر مشتبہ طور پر معلوم ہے۔ قرآن کا ہر اعلان اپنی کامل صداقت کو مسلسل برقرار رکھے ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی مدت گزرنے کے باوجود اب تک کسی کو یہ موقع نہیں ملا کہ وہ قرآن پر کسی اعتبار سے کوئی شک ظاہر کر سکے۔

2-004

انسان کی تخلیق

قرآن میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ـــــ اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا: کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بنائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔ اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اللہ نے سکھا دئے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان

لوگوں کے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہم تو وہی جانتے ہیں جو تو نے ہمیں بتایا۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا اے آدم ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب آدم نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اللہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں۔ اور مجھ کو معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ (البقرہ ۳۰ ـ ۳۳)

اللہ نے انسان کو ایک آزاد مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ اس بنا پر فرشتوں کو یہ اندیشہ تھا کہ انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے گا اور زمین کو فساد اور خونریزی سے بھر دے گا۔ تاریخ کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کے بارے میں فرشتوں کا یہ اندیشہ بالکل درست تھا۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ اللہ نے انسان کو کیوں پیدا کیا۔ اللہ کو اپنے بندوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ فرشتوں کے الفاظ میں، اس کی تحمید و تقدیس ہے، اور ان گنت فرشتے ہر لحہ یہ مطلوب کام ساری کائنات میں انجام دے رہے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان جیسی سرکش مخلوق کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اصل یہ ہے کہ فرشتے جو تحمید و تقدیس کر رہے ہیں وہ مجبورانہ تحمید و تقدیس ہے، کیوں کہ وہ اس کے سوا کچھ اور کر ہی نہیں سکتے۔ اب اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایسی مخلوق پیدا کرے جو خود اپنے آزادانہ فیصلے کے تحت اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت میں دے اور ذاتی اختیار کے تحت اللہ کی حمد و تقدیس کرے۔ فرشتوں کے شبہہ کو اللہ نے اس طرح رفع کیا کہ پوری نسل انسانی کو اپنی قدرت سے بیک وقت پیدا کیا (الاعراف ۱۷۲) اور اپنی خصوصی قدرت سے آدم کو ان سب سے متعارف کرایا اور پھر آدم سے کہا کہ ان کا تعارف کر کے فرشتوں کو بتاؤ کہ ان میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوں گے۔ اس تعارف کے بعد فرشتوں نے مانا کہ انسانوں میں اگر ابو جہل اور ابو لہب جیسے لوگ ہوں گے تو اسی کے ساتھ ان میں ابو بکر اور عمر جیسے لوگ بھی پیدا ہوں گے۔ اس تعارف کے بعد فرشتے مطمئن ہو گئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف فرشتے بلکہ پوری وسیع کائنات اور اس میں پھیلی ہوئی بے

شمار مخلوقات سب کی سب ہر آن خدا کی حمد و تقدیس میں مشغول ہیں، جیسا کہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ بے شمار چیزیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنے آزاد فیصلے کے تحت نہیں کر رہی ہیں۔ وہ اس لئے ایسا کر رہی ہیں کہ تقدیر الٰہی کے تحت ان کے لئے کچھ اور کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ صرف انسان ہے جس کو انتہائی استثنائی طور پر موت تک کے لئے اختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ دوسری چیزوں کی حمد و تقدیس گویا ایک ٹیپ ریکارڈ کی آواز کے مانند ہے اور انسان کی حمد و تقدیس ایک زندہ اور آزاد ہستی کی زبان سے نکلنے والی با اختیار آواز کی مانند۔ اور دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ مجبوارانہ حمد وتقدیس اگر پوری کائنات کے برابر ہو تب بھی ایک انسان کی آزاد حمد وتقدیس اس کے اوپر بھاری ہو جائے گی۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے ایک انتہائی نفیس قسم کی معیاری دنیا بنائی جس کا نام جنت ہے۔ ابدی لذت و راحت والی اس دنیا کے لئے اللہ کو کچھ باشندے درکار ہیں جن کو وہاں بسایا جائے۔ انہی خوش نصیب روحوں کے انتخاب کے لئے موجودہ دنیا بنائی گئی۔ ایک محدود مدت تک انسانوں کو ان کا امتحان لینے کے لئے یہاں بھیجا جاتا رہے گا اور جب خدا کا اندازہ مکمل ہو جائے گا اور مطلوب انسانوں کا انتخاب کیا جا چکا ہو گا تو اس کے بعد یہ دنیا ختم کر دی جائے گی۔ اب منتخب افراد کو جنت کی کالونیوں میں ہمیشہ کے لئے بسایا جائے گا۔ اور بقیہ لوگوں کو الگ کر کے انھیں جہنم کے کوڑا خانے میں ڈال دیا جائے گا تا کہ وہ ابدی حسرت کی سزا بھگتتے رہیں۔

یہ مطلوب انسان وہ ہیں جنھوں نے گمراہیوں کے جنگل میں خدا کو دریافت کیا۔ جنھوں نے بدی کے اندھیروں میں نیکی کا راستہ تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ جنھوں نے سرکشی کے ماحول میں خود اپنے آزاد فیصلے کے تحت اپنے آپ کو خدا کی پابندی میں دے دیا۔ جنھوں نے انانیت کے طوفان میں تواضع کی روش اختیار کی۔ جن کے اقتدار نے ان کو نہیں بگاڑا۔ جن کو مال ملا مگر وہ فخر کی نفسیات میں مبتلا نہیں ہوئے۔ جن کو موقع تھا کہ وہ اپنی ذات کے لئے جئیں، اس کے باوجود وہ ایک خدا کے لئے جئے۔ جو ڈرے تو صرف خدا سے ڈرے اور جنھوں نے محبت کی تو

صرف خدا سے محبت کی۔ جن کی خود پسندی ان کے لئے حق کے اعتراف میں رکاوٹ نہیں بنی۔ جو چلنے کی طاقت رکھتے ہوئے خدا کے خوف سے نہیں چلے۔ جن کے پاس بولنے کے لئے زبان تھی مگر خدا کی پکڑ کے احساس نے انھیں بولنے سے روک دیا۔

یہ مطلوب انسان وہ ہے جس نے غیب کا پردہ ہٹنے سے پہلے خدا کو دیکھا اور وہ اس کے آگے ڈھ پڑا۔ جس نے آخرت کی پکڑ کو اتنی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ آخرت میں احتساب کئے جانے سے پہلے دنیا ہی میں خود اپنا احتساب کرلیا۔ جس کا حال یہ ہوا کہ خدا کے ساتھ شدید محبت نے اس کے دل سے دوسری تمام محبتیں نکال دیں۔ اور خدا کے ساتھ شدید خوف نے اس کے لئے دنیا کی تمام خوشیوں اور راحتوں کو بے قیمت بنادیا۔

2-005

گروہی نجات نہیں

آخرت کی کامیابی کا تعلق کسی بھی درجہ میں گروہ بندی سے نہیں ہے۔ اس کا انحصار تمام تر عمل پر ہے نہ کہ گروہی تعلق پر۔ قرآن کی ایک آیت اس معاملے کو واضح کرتی ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' ان میں سے جو شخص ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور اس نے نیک کام کیا تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غم گین ہوں گے۔ (البقرہ ٦٢)

قرآن کی یہ آیت گروہی نجات کے نظریہ کی نفی کرتی ہے۔ اس آیت میں مسلم گروہ کو بھی دوسرے مذہبی گروہوں کے ساتھ یکساں طور پر بریکٹ کیا گیا ہے۔ اس آیت کے مطابق' گروہ کے اعتبار سے خدا کے نزدیک ایک اور دوسرے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ افراد کی ذاتی سیرت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کسی گروہ سے وابستگی کے اعتبار سے۔

آیت میں چار گروہ کا ذکر ہے۔ ایک مسلمان جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں۔ دوسرے' یہود جو اپنے کو حضرت موسیٰ کی امت کہتے ہیں۔ تیسرے نصاریٰ جو حضرت مسیح

کی امت ہونے کے دعویدار ہیں۔ چوتھے 'صابی جو اپنے کو حضرت یحییٰ کی امت بتاتے تھے۔ اور قدیم زمانے میں عراق کے علاقے میں آباد تھے۔ وہ اہل کتاب تھے اور کعبہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ مگر اب صابی فرقہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیا میں اب کہیں اس کا وجود نہیں۔

یہاں مسلمانوں کو دوسرے گروہوں سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کا اور دوسرے پیغمبروں سے نسبت رکھنے والی امتوں کا 'ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گروہ ہونے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک سب برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔ گروہ کے اعتبار سے ایک گروہ اور دوسرے گروہ میں کوئی فرق نہیں۔ سب کی نجات کا ایک ہی محکم اصول ہے۔ اور وہ ہے ایمان اور عمل صالح۔ کوئی گروہ خواہ اپنے کو مسلمان کہتا ہو یا وہ اپنے کو یہودی یا مسیحی یا صابی یا کچھ اور کہے' ان میں سے کوئی بھی گروہ محض ایک مخصوص گروہ ہونے کی بنا پر خدا کے یہاں کوئی خصوصی درجہ نہیں رکھتا۔ درجہ کا اعتبار اس پر ہے کہ کس نے خدا کی منشا کے مطابق 'اپنی عملی زندگی کو ڈھالا۔

پیغمبر کے زمانے میں جب اس کے ماننے والوں کا گروہ بنتا ہے تو اس کی بنیاد ہمیشہ ایمان اور عمل صالح پر ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی پکار کو سن کر کچھ لوگوں کے اندر ذہنی اور فکری انقلاب آتا ہے۔ ان کے اندر ایک نیا عزم جاگتا ہے۔ ان کی زندگی کا نقشہ جو اب تک ذاتی خواہشوں کی بنیاد پر چل رہا تھا وہ خدائی تعلیمات کی بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں پیغمبر کی امت ہوتے ہیں۔ ان کے لئے پیغمبر کی زبان سے آخرت کی نعمتوں کی بشارت دی جاتی ہے۔

مگر بعد کی نسلوں میں صورت حال بدل جاتی ہے۔ اب خدا کا دین ان کے لئے ایک قسم کی قومی روایت بن جاتا ہے۔ جو بشارتیں ایمان و عمل کی بنیاد پر دی گئی تھیں ان کو محض گروہی تعلق کا نتیجہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ گمان کر لیتے ہیں کہ ان کے گروہ کا اللہ سے کوئی خاص رشتہ ہے' جو دوسرے لوگوں سے نہیں ہے۔ جو شخص اس مخصوص گروہ سے تعلق رکھے' خواہ عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے وہ کیسا ہی ہو بہر حال اس کی نجات ہو کر رہے گی۔ جنت اس کے اپنے گروہ کے لئے

ہے۔اور جہنم صرف دوسرے گروہوں کے لئے۔

مگر اللہ کا کسی گروہ سے خصوصی رشتہ نہیں۔ اللہ کے یہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی اپنے فکر اور عمل میں کیسا ہے۔ آخرت میں آدمی کے انجام کا فیصلہ اس کے حقیقی کردار کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ گروہی نسبتوں کی بنیاد پر۔

جب کوئی دینی تحریک اٹھتی ہے تو دھیرے دھیرے اس کا ایک گروہ بن جاتا ہے۔ لیکن گروہ کی اہمیت جو کچھ ہے وہ صرف دنیا کے اعتبار سے ہے۔ آخرت میں ہر آدمی خدا کے یہاں اکیلا پہنچے گا۔ ہر فرد اپنے ذاتی کردار کی بنیاد پر یا سزا کا مستحق قرار پائے گا یا انعام کا۔

2-006

امت وسط

امت محمدی کی حیثیت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنادیا تاکہ تم ہو بتانے والے لوگوں پر اور رسول ہو تم پر بتانے والا۔ اور جس قبلہ پر تم تھے، ہم نے اس کو صرف اس لئے ٹھہرایا تھا کہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اس سے الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اور بے شک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے۔ اور اللہ ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو ضائع کردے۔ بے شک اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کرنے والا مہربان ہے (البقرہ ۱۴۳)

وسط کے معنی بیچ کے ہیں۔ امت وسط کا مطلب ہے بیچ کی امت۔ امت محمدی کو امت وسط اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوام عالم کے درمیان بیچ کی کڑی ہے۔ انھیں پیغمبر اسلام سے خدا کے دین کو کسی کمی بیشی کے بغیر لینا ہے اور پھر اس کو ٹھیک ویسا ہی اقوام عالم تک پہنچانا ہے۔ یہ عمل نسل در نسل مسلسل جاری رکھنا ہے، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مفسر ابن زید نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ (وکذالك جعلناکم أمة وسطا) قال: هم وسط بين النبی صلی الله علیه وسلم وبين الامم۔ (تفسیر الطبری ۸/۲)

یعنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام رسول اللہ ﷺ اور دیگر اقوام کے درمیان ہیں۔

خدا کے تخلیقی نقشہ کے مطابق، عالم انسانی کی یہ ایک مستقل ضرورت ہے کہ اس کے درمیان ہر نسل میں اور ہر گروہ میں ایسے افراد پیدا ہوتے رہیں جو انسانوں کو مسلسل خدا کے تخلیقی نقشہ سے باخبر کرتے رہیں تاکہ انسان دنیا میں غفلت کی حالت میں نہ جئے بلکہ حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو کر زندگی گزارے۔ اسی مشن کے تحت پچھلے زمانوں میں بار بار خدا کے پیغمبر آتے رہے۔ پیغمبر اسلام اس سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تھے۔ اب آپ کے بعد کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔

اب اگرچہ سلسلۂ نبوت بند ہو چکا ہے، لیکن کار نبوت اب بھی پوری طرح باقی ہے۔ تاکہ انسانیت کی اگلی نسلوں تک بھی اسی طرح حق کا پیغام پہنچتا رہے جس طرح وہ پچھلی نسلوں تک پہنچتا رہا۔ بعد کے زمانے میں پیغام رسانی کے اسی کام کو جاری رکھنے کے لئے امت محمدی کو امت وسط بنایا گیا۔ یہ امت محمدی کی لازمی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ مسلسل پیغام رسانی کے اس کام کو انجام نہ دے تو اس کا امت محمدی ہونا ہی اللہ کی نظر میں مشتبہ ہو جائے گا۔

2-007

روزہ اسلام میں

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح وہ تم سے اگلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بنو (البقرہ ۱۸۳) اس کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ اہل ایمان ہر سال رمضان کے مہینے میں پورے مہینہ کا روزہ رکھیں۔ اس کی حکمت یہ بتائی گئی کہ اس سے ان کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس کے فوراً بعد فرمایا کہ ـــــ اور جب میرے بندے تم سے میری بابت پوچھیں تو میں نزدیک ہوں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ تو چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔ (البقرہ ۱۸۶)

روزہ کا تفصیلی حکم قرآن میں اسی ایک مقام پر آیا ہے۔ ان آیات کے مطالعے سے روزہ کے بارے میں جو بنیادی احکام معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ پہلی بات یہ بتائی گئی کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حکم پچھلے پیغمبروں کی شریعت میں بھی دیا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، پچھلے پیغمبر ہر زمانے میں اور ہر مقام پر آتے رہے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ روزہ کا تعلق زمانی حالات یا جغرافی اسباب سے نہیں ہے۔ وہ نماز کی طرح ایک مطلق عبادت ہے۔ روزہ ہمیشہ اور ہر حال میں فرض رہا ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ شرعی عذر کے سوا کوئی اور چیز اس کو ساقط کرنے والی نہیں۔

۲۔ روزہ کا ایک مقصد قرآن میں تقویٰ بتایا گیا ہے۔ یعنی روزہ آدمی کے اندر اللہ کا ڈر پیدا کرتا ہے۔ اللہ سے ڈرنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی ہر چیز کے بارے میں یہ یقین کرے کہ وہ خدا کا عطیہ ہے۔ اور خدا جب چاہے ان چیزوں کو چھین لے اور ہمیں محروم کر کے رکھ دے۔ رمضان کا روزہ آدمی کے اندر یہی احساس پیدا کرنے کی ایک سالانہ تدبیر ہے۔ اس مہینے میں آدمی خود اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو کھانے اور پینے سے وقتی طور پر محروم کرتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ پر بھوک اور پیاس طاری کر کے یہ تجربہ کرتا ہے کہ اگر خدا اس کو مستقل طور پر کھانے اور پینے سے محروم کر دے تو وہ کتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ احساس اس کے اندر وہ ربانی کیفیت پیدا کرتا ہے جس کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے۔

۳۔ روزہ کا دوسرا فائدہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ آدمی کے اندر شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آدمی اپنا سارا دن بھوک اور پیاس میں گزارتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حال میں شام آجاتی ہے اور سورج غروب ہوتا ہے۔ اب وہ اپنا روزہ توڑتا ہے اور سیر ہو کر کھاتا اور پیتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کا حال وہ ہو جاتا ہے جس کو ایک مسنون دعا میں اس طرح بتایا گیا ہے: ذھب الظماء وابتلت العروق (پیاس چلی گئی اور رگیں تر ہو گئیں)

روزہ کے بعد افطار کا طریقہ آدمی کو تجرباتی طور پر اس حقیقت کی یاد دلاتا ہے کہ خدا نے پانی اور غذا کی صورت میں انسان کے لئے کتنی بڑی نعمت پیدا کی ہے۔ اور پھر ایک نعمت کے بارے میں یہ تجربہ آدمی کو دوسری تمام نعمتوں کی یاد دلاتا ہے۔ اور اس کا سینہ شکر خداوندی کے

جذبہ سے بھر جاتا ہے۔اس طرح روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ شکر کرنے والا بن کر خدا کی دنیا میں رہے۔

۴۔ روزہ کی عبادت آدمی کے اندر ایک اور اہم صفت پیدا کرتی ہے۔ اور وہ دعا ہے۔ روزہ کا مہینہ روزہ دار کے لئے روحانی تربیت کا مہینہ ہے۔اس مہینہ میں آدمی بھوک پیاس کی مشقت اٹھا کر اپنے وجود کے مادی پہلو کو دباتا ہے اور اس کے غیر مادی پہلو کو ابھارتا ہے۔ نمازوں کی کثرت اس کے اندر عبدیت کے احساس کو بیدار کرتی ہے۔ قرآن کو زیادہ سے زیادہ سننے اور پڑھنے سے اس پر قرآن کے معانی کھلتے ہیں۔اور اس کے اندر خدا کی عظمت کا شعور جاگتا ہے۔وہ خدا سے ڈرنے والا، خدا کا شکر کرنے والا اور اس کی بڑائی کرنے والا بن جاتا ہے۔

اس طرح روزہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ خدا سے سچی دعا کرنے والا بن جائے۔اس کی دعا کیفیات سے بھری ہوئی دعا ہو۔اس کی دعا ایک تڑپنے والے انسان کی دعا ہو۔اس کی دعا ایک ایسے انسان کی دعا ہو جو خدا کے پاس پہنچ جائے، جو خدا کے عین قریب ہو کر اس کو پکارنے لگے۔

2-008

قانون فطرت

قوموں کے عروج وزوال کے باب میں فطرت کا ایک قانون بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(البقرہ ۲۴۹)

اس آیت میں اذن اللہ سے مراد فطرت کا قانون ہے اور فطرت کا یہ قانون صبر کے اصول پر مبنی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چھوٹا گروہ محض چھوٹا ہونے کی بنا پر مغلوب نہیں ہو جاتا۔اگر وہ صبر کا ثبوت دے تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنے سے بڑے گروہ پر غالب آجائے۔

یہ معاملہ کوئی پراسرار معاملہ نہیں۔یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نفسیات انسانی کے جائزہ اور قوموں کی تاریخ کے مطالعہ سے سمجھی جاسکتی ہے۔اصل یہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر اتھاہ

صلاحیت کا مالک ہوتا ہے مگر یہ صلاحیت عام حالات میں آدمی کے اندر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ اس چھپی ہوئی صلاحیت کو جو چیز جگاتی ہے وہ چیلنج ہے۔ جس فرد یا قوم کو اپنے ماحول کی طرف سے چیلنج پیش آئے، اس کی صلاحیت جاگ اٹھے گی۔ وہ پہلے اگر صرف ایک بشر (man) تھا تو چیلنج کی زد میں آنے کے بعد وہ فوق البشر (super man) بن جائے گا۔ اب وہ ایسے کارنامے انجام دے گا جس کا تصور بھی چیلنج سے پہلے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جس سماج میں دو گروہ ہوں، ایک اقلیتی گروہ اور دوسرا اکثریتی گروہ، ایسے سماج میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اکثریت کی طرف سے اقلیت کو چیلنج پیش آتا ہے۔ زندگی کے ہر محاذ پر اقلیت کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت اس کو دبا لے گی۔ وہ اکثریت کے مقابلہ میں مغلوب ہو کر رہ جائے گا۔

یہ صورت حال اقلیت کے لئے ایک سخت امتحان ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے رد عمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صابرانہ رد عمل، دوسرا غیر صابرانہ رد عمل۔ غیر صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ اقلیتی گروہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جائے۔ وہ منفی طریقوں سے اس کا جواب دینے کی کوشش کرے۔ یہ گویا چیلنج کے مقابلہ میں منفی جواب (negative response) دینا ہے۔ اور جو اقلیت چیلنج کے مقابلہ میں اس قسم کا منفی جواب دے وہ مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ اس کی فطری صلاحیتیں بدستور خوابیدہ حالت میں پڑی رہیں گی۔ ایسی اقلیت چیلنج کے اندر گھر کر اسی طرح ختم ہو جائے گی جس طرح چھوٹی چڑیاں طوفان میں گھر کر ختم ہو جاتی ہیں۔

اس کے برعکس جو اقلیت چیلنج کے مقابلہ میں صابرانہ روش کا ثبوت دے وہ گویا طوفان کی بڑی چڑیا (big bird of the storm) ہے۔ وہ اپنے طاقتور بازوؤں سے اڑ کر اوپر چلی جائے گی اور اس طرح اپنے آپ کو طوفان کی زد سے بچا لے گی۔

چیلنج کے مقابلہ میں صبر کا رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کی نفسیات کے ساتھ اس کا استقبال کرے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے کہ اس کا دماغ درہم برہم ہو جائے

اور وہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں مثبت طور پر سوچنے کے قابل نہ رہے۔ جو فرد یا گروہ چیلنج کے مقابلہ میں اس طرح مثبت جواب (positive response) کا انداز اختیار کرے اس کا فائدہ اس کو یہ ملتا ہے کہ اس کے اندر نیا حوصلہ ابھر آتا ہے۔ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس کے اندر وہ فکری انقلاب پیدا ہوتا ہے جس کو نفسیات کی زبان میں دماغی طوفان (brain storm) کہا جاتا ہے۔

یہ چیزیں اقلیتی افراد کے اندر سوئے ہوئے انسان کو بیدار کر دیتی ہیں۔ ایسے افراد زندگی کے ہر میدان میں اکثریت سے زیادہ عمل کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہنی ارتقاء کی بنا پر اس قابل ہوتے ہیں کہ مسائل کا برتر حل (superior solution) تلاش کر سکیں۔ اقلیتی گروہ میں یہ تمام صفات صبر کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور فطرت کا یہ قانون ہے کہ زندگی کے معرکہ میں جو صبر کا ثبوت دیں اس دنیا میں وہ لازماً غلبہ حاصل کریں گے۔ حتی کہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں بھی۔

2-009

ایک دعاء

سورہ البقرہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے۔ وہ دعا یہ ہے: ربنا لا تؤاخذنا ان نسينا أو اخطأنا ربنا ولا تحمل علينا اصراً كما حملته على الذين من قبلنا ربنا ولا تحملنا ما لا طاقة لنا به واعف عنا واغفرلنا و ارحمناأنت مولانا فانصرنا على القوم الكافرين (البقرہ ۲۸۶)

اے ہمارے رب ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا ہم غلطی کریں۔ اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ڈالا تھا ہم سے اگلوں پر۔ اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم کو نہیں اور در گزر کر ہم سے اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا کارساز ہے۔ پس انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

دعا کیا ہے۔ دعا بندے کے قلبی احساسات کا خدا کے سامنے اظہار ہے۔ جب ایک انسان ایک طرف اپنے کامل عجز کو اور دوسری طرف خدا کی کامل قدرت کو دریافت کرتا ہے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بے تابانہ طور پر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس کے اندر یہ تڑپ جاگ اٹھتی ہے کہ وہ اپنے سارے احساسات اور اپنے سارے جذبات کو اپنے رب کے سامنے پیش کردے۔ وہ اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کا کامل اظہار بن جائے۔ یہ لطیف احساسات جب لفظوں کی صورت میں ڈھل جائیں تو اسی کا نام دعا ہے۔

مذکورہ الفاظ بظاہر قرآن کے الفاظ ہیں مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ فطرت انسان کی پکار ہے۔ ان الفاظ میں گویا کہ خود انسان کے خالق نے ایک سچے انسان کے اندر اٹھنے والے ربانی جذبات کو لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔

ایک آدمی کو جب سچا ایمان حاصل ہوتا ہے تو وہ بے تابانہ طور پر یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کی اطاعت میں دے دے۔ مگر ایک طرف خدا کی بے پناہ عظمت اور دوسری طرف اپنے بے پناہ عجز کی بنا پر اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اطاعت الٰہی کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے یہ احساسات مذکورہ قسم کے دعائیہ الفاظ میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہہ پاتا کہ خدایا! میں تیرے دربار میں اعمال کا تحفہ لے کر آیا ہوں تو اس کو قبول فرما۔ اس کی نظر اپنے کیے پر نہیں ہوتی بلکہ اس پر ہوتی ہے جو وہ نہ کر سکا ہو۔

ان احساسات کے تحت وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا! میری غلطیوں اور خطاؤں کا مجھ سے حساب نہ لے۔ مجھ کو ان آزمائشوں میں نہ ڈال جن سے میرے پیش روؤں کو گزرنا پڑا۔ خدایا! مجھ سے تھوڑے عمل کو قبول کرلے، کیوں کہ میرے اندر زیادہ عمل کی طاقت نہیں۔ خدایا جب تو میرا حساب لے تو میرے ساتھ معافی اور درگذر کا معاملہ فرما۔ اور مجھ کو اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔ خدایا تو میرے دشمنوں کے خلاف میری مدد فرما، اور میری طرف سے ان کے مقابلہ کے لئے کافی ہو جا۔

3-010

محکم، متشابہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس کی آیتیں بنیادی طور پر دو قسم کی ہیں ــــــ محکم اور متشابہ۔ اس سلسلے میں قرآن کا بیان یہ ہے: وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری۔ اس میں بعض آیتیں محکم ہیں، وہ کتاب کی اصل ہیں۔ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں۔ پس جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہ آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں فتنہ کی تلاش میں اور اس کے مطلب کی تلاش میں۔ حالاں کہ ان کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ پختہ علم والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (آل عمران ۷)

قرآن کی اس آیت میں متشابہات کا مطلب متماثلات ہے۔ یعنی تمثیلات کی زبان۔ قرآن میں غیب کی باتوں کو تمثیل کی زبان میں واضح کیا گیا ہے اور موجودہ معلوم دنیا کی باتوں کو محکم زبان میں۔

قرآن میں دو طرح کے مضامین ہیں۔ ایک وہ جو انسان کی معلوم و معروف دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً تاریخی واقعات، کائناتی نشانیاں، دنیوی زندگی کے احکام وغیرہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق ان غیبی امور سے ہے جو آج کے انسان کے لئے ناقابل ادراک ہیں۔ مثلاً خدا کی صفات، جنت دوزخ کے احوال، فرشتوں کی نوعیت، وغیرہ۔ پہلی قسم کی باتوں کو قرآن میں محکم انداز، بالفاظ دیگر براہ راست اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسری قسم کی باتیں انسان کی نامعلوم دنیا سے متعلق ہیں، وہ انسانی زبان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اس لئے ان کو متشابہ انداز یعنی تمثیل و تشبیہ کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انسان کا ہاتھ کہا جائے تو یہ براہ راست زبان کی مثال ہے اور اللہ کا ہاتھ تمثیلی زبان کی مثال۔

جو لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے وہ متشابہ آیتوں کا مفہوم بھی اس طرح متعین کرنے لگتے

ہیں جس طرح محکم آیتوں کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ یہ اپنے فطری دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آدمی ہمیشہ بھٹکتا رہے اور کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ کیوں کہ "انسان کے ہاتھ" کو متعین طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر "خدا کے ہاتھ" کو موجودہ عقل کے ساتھ متعین طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔

قرآن فہمی کا یہ اصول عین فطرت کے اصول کے مطابق ہے۔ انسان کو ہر معاملے میں یہی کرنا پڑتا ہے کہ وہ کچھ باتوں کو کامل طور پر جاننے کی کوشش کرے، اور کچھ دوسری باتوں کے سلسلے میں اجمالی علم پر اکتفا کرے۔ یہی عام اصول قرآن کو سمجھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔ جو لوگ اس اصول کو ملحوظ نہ رکھیں وہ قرآن کو پڑھ کر اس سے صرف ذہنی انتشار کی غذا حاصل کریں گے، وہ اس سے حقیقی استفادہ نہیں کرسکتے۔

3-011

خدا کا عطیہ

قرآن میں جس طرح عبادت کے احکام ہیں اسی طرح قرآن میں تاریخ میں تبدیلی کے قوانین بھی بتائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا ایک حصہ یہ ہے: تم کہو کہ اے اللہ، سلطنت کے مالک، تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔ اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو بے جان سے جان دار نکالتا ہے اور تو جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (آل عمران ۲۶۔۲۷)

قرآن کی یہ آیت انسانی تاریخ کے بارے میں ایک اہم خدائی قانون کو بتاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ دنیا میں کسی کو اقتدار کا ملنا اور کسی سے اقتدار کا چھن جانا دونوں تمام تر خدا کے فیصلے کے تحت ہوتے ہیں۔ جس طرح زمین پر رات اور دن کا آنا تمام تر خدائی نظام کے تحت ہوتا ہے اسی طرح

اقتدار کا بھی کسی سے چھننا اور کسی کو دیا جانا تمام تر خدائی معاملہ ہے نہ کہ محض ایک انسانی معاملہ۔

اس دنیا میں اقتدار کو نشانہ بنا کر مہم چلانا ایسا ہی ہے جیسے رات اور دن کے نظام کو بدلنے کے لئے مہم چلانا۔ اقتدار کے نظام میں تبدیلی خدائی مصلحتوں کے تحت ہوتی ہے نہ کہ انسانی کوششوں کے تحت۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے حاصل شدہ دائرہ میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے، اور اقتدار کے دائرہ میں قناعت کے اصول کو اختیار کرے۔

ہر قسم کی عزت و طاقت اللہ کے اختیار میں ہے۔ وقت کے بڑے جس کو بے حقیقت سمجھ لیں، خدا چاہے تو اسی کے حق میں عزت و سربلندی کا فیصلہ کر دے۔ علم کی گدیوں پر بیٹھنے والے جس کے جہل کا فتویٰ دیں، خدا چاہے تو اسی کے ذریعہ علم کا چشمہ جاری کر دے۔ خدا کی نظر میں اگر کوئی عزت و طاقت کا مستحق ہو سکتا ہے تو وہ جو اس کو خالص خدا کی چیز سمجھے اور خدا کی نظر میں اس کا سب سے زیادہ غیر مستحق اگر کوئی ہے تو وہ جو اس کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لے۔

خدا وسیع تر کائنات میں روزانہ بہت بڑے پیمانہ پر یہ کرشمہ دکھا رہا ہے کہ وہ تاریکی کو روشنی کے اوپر اوڑھا دیتا ہے اور روشنی کو تاریکی کے اوپر ڈال دیتا ہے۔ وہ مردہ عناصر سے زندگی وجود میں لاتا ہے اور زندہ چیزوں کو مردہ عناصر میں تبدیل کرتا ہے۔ خدا کی یہی قدرت اگر انسانی تاریخ میں ظاہر ہو تو اس میں تعجب کی کیا ضرورت۔

3-012

ربانی بنو

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کسی انسان کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب اور حکمت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم اللہ والے بنو اس واسطے کہ تم دوسروں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔ (آل عمران ۷۹)

اس آیت کے مطابق خدا کے پیغمبروں نے انسان کو جو تعلیم دی وہ یہ تھی کہ اے لوگو! تم لوگ ربانی بنو۔ ربانی کا مطلب ہے رب والا۔ یہ لفظ قرآن میں اس انسان کے لئے استعمال ہوا ہے

جو غیر خدا پرستانہ زندگی کو چھوڑ کر خدا پرستانہ زندگی اختیار کرے، جو غیر اللہ میں جینے کے بجائے صرف اللہ میں جینے لگے۔ جس کے صبح و شام صرف آخرت کی یاد میں بسر ہوں نہ کہ ان دنیوی اور مادی چیزوں میں جن کے درمیان موجودہ زندگی میں آدمی کو رہنا پڑتا ہے۔

عام انسان کی غذا اگر مادیت ہے تو ربانی انسان کی غذا روحانیت۔ عام انسان کی دلچسپیاں اگر ظاہری چیزوں میں بکھری ہوئی ہوتی ہیں تو ربانی انسان اعلیٰ حقیقتوں کو اپنی دلچسپی کا مرکز بناتا ہے۔ عام انسان اگر مخلوقات میں جیتا ہے تو ربانی انسان خالق کائنات میں۔

ربانی انسان کو تواضع میں لذت ملتی ہے نہ کہ فخر میں۔ ربانی انسان معاف کرنے کو محبوب سمجھتا ہے نہ کہ انتقام لینے کو۔ ربانی انسان کو سادگی پسند ہوتی ہے نہ کہ نمائش اور تکلف۔ ربانی انسان پچھلی سیٹ پر بیٹھنا پسند کرتا ہے نہ کہ اگلی سیٹ پر۔ ربانی انسان وہ ہے جو بولے کم اور سوچے زیادہ۔ جو دوسروں کے احتساب سے زیادہ اپنے احتساب میں دلچسپی رکھتا ہو۔ جس کو پانے میں خوشی نہ ہو اور کھونا جس کو غمگین نہ کرے۔ جس کی توجہات کا مرکز کل والی دنیا ہو نہ کہ آج والی دنیا۔

3-013

اسلامی روحانیات

اسلام کے مطابق، روحانیت کا سرچشمہ کسی پراسرار قسم کی ورزش یا عملیات میں نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ حقائق عالم میں غور و فکر ہے۔ غور و فکر کے ذریعہ آدمی یہاں ایسے فیضانات حاصل کرتا ہے جو اس کے اندر روحانی تموج پیدا کریں اور اس کو مادی انسان سے اٹھا کر روحانی انسان بنا دیں۔ یہ حقیقت قرآن کی ان آیتوں سے معلوم ہوتی ہے:

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہہ اٹھتے ہیں اے ہمارے رب تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے، بس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب تو نے جس کو آگ

میں ڈالا اس کو تو نے واقعی رسوا کر دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اے ہمارے رب ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ۔ پس ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب تو نے جو وعدے اپنے رسول کی معرفت ہم سے کیے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں۔ (آل عمران ۱۹۰۔ ۱۹۴)

اسلام کے مطابق، روحانیت کسی پر اسرار دنیا میں گم ہونے کا نام نہیں ہے اور نہ وہ ایک ایسی تلاش ہے جو خود اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے اور اپنی ذات ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی روحانیت یہ ہے کہ آدمی حقیقت خداوندی کا زندہ عرفان حاصل کرے۔ وہ حقیقتوں کی ابدی دنیا میں اپنے لئے ایک باشعور مقام پالے۔ اسلامی روحانیت کا سفر معلوم راستوں سے ہو کر گزرتا ہے نہ کہ نامعلوم وادیوں سے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک خاموش اعلان ہے۔ آدمی جب اپنے کان اور آنکھ سے مصنوعی پردوں کو ہٹاتا ہے تو وہ اس خاموش اعلان کو ہر طرف سننے اور دیکھنے لگتا ہے۔ اب اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی کائنات جس کے ستارے اور سیارے کھربوں سالوں تک بھی ختم نہیں ہوتے وہاں انسان اپنی تمام خواہشوں اور تمناؤں کو لئے ہوئے صرف پچاس سال اور سو سال میں ختم ہو جائے۔ ایک ایسی دنیا جہاں درختوں کا حسن اور پھولوں کی لطافت ہے۔ جہاں ہوا اور پانی اور سورج جیسی بے شمار بامعنی چیزوں کا اہتمام کیا گیا ہے وہاں انسان کے لئے حزن اور غم کے سوا کوئی اور انجام نہ ہو۔

پھر یہ بھی اس کو ناممکن نظر آتا ہے کہ ایک ایسی دنیا جہاں یہ اتھاہ امکان رکھا گیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹا سا بیج زمین میں ڈالا جائے تو اس کے اندر سے ہرے بھرے درخت کی ایک پوری کائنات نکل آئے۔ وہاں آدمی نیکی کی زندگی اختیار کر کے بھی اس کا کوئی پھل نہ پاتا ہو۔ ایک ایسی

دنیا جہاں ہر روز تاریک رات کے بعد روشن دن آتا ہے وہاں صدیاں گزر جائیں اور عدل وانصاف کا اجالا اپنی چمک نہ دکھائے۔ ایک ایسی دنیا جس کی گود میں زلزلے اور طوفان سو رہے ہیں وہاں انسان ظلم پر ظلم کرتا ہے مگر کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا سامنے نہ آئے۔

جو لوگ حقیقتوں میں جیتے ہیں اور گہرائیوں میں اتر کر سوچتے ہیں ان کے لئے ناقابل یقین ہو جاتا ہے کہ ایک بامعنی کائنات بے معنی انجام پر ختم ہو جائے۔ غور و فکر کے بعد وہ جان لیتے ہیں کہ حق کا داعی جو پیغام دے رہا ہے وہ نطق کی زبان میں اسی بات کا اعلان ہے جو خاموش زبان میں ساری کائنات میں نشر ہو رہا ہے۔ ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ جب سچائی کھلے اور جب انصاف کا سورج نکلے تو اس دن وہ ناکام و نامراد نہ ہو جائیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہوئے اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، وہ مفاد اور مصلحت کی تمام حدوں کو توڑ کر داعیٔ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں تاکہ جب کائنات کا "اجالا" اور کائنات کا "اندھیرا" ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں تو کائنات کا مالک ان کو اجالے میں جگہ دے، وہ ان کو اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہ چھوڑے۔

یہ ذہنی دریافت آدمی کی پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔ اب وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے، ایک ایسا انسان جو دنیا میں بامعنی زندگی کی تعمیر کرے اور آخرت میں بھی اپنے لئے ایک بامعنی زندگی حاصل کرے۔

4-014

شرک ناقابلِ معافی

اسلام میں گناہ کا یہ تصور نہیں کہ ایک بار اس کا ارتکاب کرنے کے بعد اس کی معافی نہیں ہو سکتی۔ اسلام کے مطابق، توبہ اور اعتراف کے بعد ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ البتہ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو خدا کے یہاں قابل معافی نہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

بے شک اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔ لیکن اس کے علاوہ جو

کچھ ہے اس کو جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا اس نے بڑا طوفان باندھا۔ (النساء ۴۸)

شرک کیا ہے۔ شرک یہ ہے کہ ان چیزوں میں کسی کو اللہ کا شریک اور ہم سر ٹھہرا لیا جائے۔ جو صرف خدا کے لئے خاص ہیں۔ مثلاً کائنات کی تخلیق اللہ نے تنہا اپنی قدرت سے کی ہے۔ اب اگر کوئی شخص تخلیق کے اس عمل میں کسی اور کو شامل کرے تو وہ شرک ہوگا۔ اللہ کائنات کے نظام کو تنہا چلا رہا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کو بھی کائنات کے نظام میں متصرف مانے تو یہ شرک ہوگا۔ ہر قسم کا اختیار حقیقی طور پر صرف ایک اللہ کو حاصل ہے۔ اب اگر کوئی مانے کہ ان اختیارات میں کوئی اور بھی حصہ دار ہے تو یہ شرک ہوگا۔ انسان کو دنیا میں جو مختلف قسم کا رزق ملتا ہے وہ تمام تر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص سمجھے کہ کوئی اور بھی ہے جو رزق رسانی کا اختیار رکھتا ہے تو یہ شرک ہوگا۔

اسی طرح الٰہ یا معبود کا درجہ صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کو معبود مانے تو یہ شرک ہوگا۔ اسی طرح عبادت کی قسم کے تمام اعمال صرف ایک خدا کا حق ہیں۔ اب اگر کوئی شخص خدا کے ساتھ کسی اور کی عبادت کرنے لگے تو یہ خدا کے ساتھ شرک ہوگا۔ اسی طرح قرآن کے مطابق، حبِّ شدید اور خوفِ شدید بھی صرف ایک خدا کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک خدا کے سوا کسی اور کی حبِّ شدید یا خوف شدید میں مبتلا ہو جائے تو یہ بھی شرک جیسا ایک عمل ہوگا، وغیرہ۔

شرک ناقابل معافی کیوں ہے۔ اس لئے کہ یہ خدا کی دنیا میں کسی اور کو خدائی کا درجہ دینا ہے۔ یہ خدا کے غیر مشترک حقوق میں کسی اور کو حصہ دار بناتا ہے۔ یہ قرآن کے لفظوں میں کسی اور کو خدا کے ساتھ اس کا ندّ (ہمسر) ٹھہراتا ہے۔ اس قسم کا فعل اپنی نوعیت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو عام دنیوی اصطلاح میں ریاست سے غداری (treason) یا ریاست سے بغاوت (rebellion) کہا جاتا ہے۔ غداری اور بغاوت جس طرح دنیوی سلطان کے یہاں ناقابل

معافی جرم سمجھے جاتے ہیں، اسی طرح سلطان حقیقی کے یہاں بھی اس قسم کا فعل نا قابل معافی جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرک بلاشبہ اللہ کی سب سے بڑی ناقدری ہے۔ اللہ بشری تقاضے کے تحت پیش آنے والے کسی گناہ کو معاف کر سکتا ہے مگر جو لوگ جان بوجھ کر خدا کی ناقدری کی جسارت کریں وہ یقیناً قابل معافی نہیں ہو سکتے۔

4-015

تحاکم الی الطاغوت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا: اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں اہل اختیار کی اطاعت کرو۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ہے تم سے پہلے، وہ چاہتے ہیں کہ قضیہ لے جائیں طاغوت کی طرف، حالاں کہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کو نہ مانیں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہکا کر بہت دور ڈال دے۔ (النساء ۵۹۔۶۰)

اس آیت میں طاغوت سے مراد قدیم مدینہ کا یہودی سردار کعب بن اشرف ہے۔ (تفسیر القرطبی ۵/ ۲۶۳) اصل یہ ہے کہ مدنی دور کے ابتدائی سالوں میں وہاں اسلام کا کامل اقتدار قائم نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی جن کے پاس لوگ اپنے نزاعات اور مقدمات کا فیصلہ لینے کے لئے آتے تھے۔ دوسری طرف کعب بن اشرف تھا جس کو وہاں عرصہ سے ایک قسم کی عدالتی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ جب بھی مدینہ (یثرب) کے دو آدمیوں میں نزاع قائم ہوتی تو دونوں کعب بن اشرف کے پاس آتے اور اس سے اپنے نزاع کا فیصلہ کراتے۔

اس زمانے میں بعض ایسے واقعات ہوئے جب کہ کسی کمزور مسلمان نے اپنے مقدمے

کے فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کعب بن اشرف کی طرف رجوع کیا، اس امید میں کہ وہ وہاں اپنی مرضی کے موافق فیصلہ لے سکے گا۔ اس پر یہ آیت اتری اور کہا گیا کہ جو مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کعب بن اشرف کے یہاں اپنا مقدمہ لے جاتے ہیں وہ شیطان کی پیروی کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ قرآنی حکم ان تمام ملکوں پر چسپاں ہوتا ہے جہاں سیکولر عدالتیں قائم ہیں۔ ان ملکوں کے مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع قائم ہو، خواہ وہ مالی ہو یا غیر مالی، تو ان پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ اپنے نزاعی معاملے کا فیصلہ قرآن و سنت سے کرائیں۔ یعنی ان ملکوں کے دار الافتاء یا دار القضاء یا علماء کی مجلس کے سامنے مقدمہ پیش کیا جائے اور وہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ دیں اس کو دونوں فریق بے چون و چرا مان لیں۔ ان ملکوں کے مسلمان اگر ایسا نہ کریں بلکہ وہ اپنے مقدمات اور نزاعات کو سیکولر عدالتوں میں لے جائیں اور وہاں سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے حاصل کریں تو ایسے مسلمان بلاشبہ مذکورہ آیت کا مصداق ہوں گے۔

یہ آیت سیاسی معنیٰ میں نہیں ہے یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان ہر جگہ اسلامی حکومت قائم کریں اور اس کے تحت شرعی عدالت کا نظام بنائیں تا کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں کیا جا سکے۔ اس آیت کا تعلق حاکمانہ نفاذ قانون سے نہیں ہے بلکہ خود اپنی رغبت سے اسلامی حکم کو تسلیم کرنے سے ہے۔ چنانچہ یہ آیت ہر جگہ قابل عمل ہے۔ اسلامی حکومت میں اسلامی عدالتوں کے ذریعہ۔ اور جہاں اسلامی حکومت نہ ہو وہاں علماء اسلام کی مجلس فتویٰ یا مجلس قضاء کے ذریعہ۔

جس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو وہاں کے لئے اس قرآنی حکم کا مطلب یہ ہو گا کہ مسلمانوں کے اوپر حاکمانہ طاقت کے ذریعہ اسلامی قانون کا نفاذ کیا جائے۔ اور جہاں اسلامی حکومت قائم نہ ہو وہاں بھی یہ اسلامی حکم بدستور مطلوب رہے گا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اسلامی حکومت میں اگر اس کا نفاذ حاکمانہ طاقت سے کیا جائے گا تو غیر اسلامی حکومت میں ہر مسلمان پر یہ

فرض ہوگا کہ وہ رضاکارانہ طور پر خود اپنی مرضی سے اس کو اپنے اوپر عائد کرے۔

4-016

یکساں محاسبہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آخرت میں انسانوں کا جو محاسبہ ہوگا اس میں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، بلکہ ایک ہی اصول انصاف کی بنیاد پر سب کا حساب ہوگا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو کوئی بھی برا کرے گا وہ اس کا بدلہ پائے گا۔ اور وہ نہ پائے گا اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔ اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔ (النساء۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴)

پیغمبر کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ پیغمبر کی امت کہے جاتے ہیں۔ اس امت کی پہلی نسل کے افراد کا ایمان زندہ ایمان ہوتا ہے۔ ان کی زندگی عمل صالح کا نمونہ ہوتی ہے۔ مگر امت کی بعد کی نسلوں میں ایمان و عمل کا جذبہ کمزور ہو جاتا ہے۔ اب وہ عمل کے بجائے آرزوؤں اور خوش گمانیوں میں جینے لگتے ہیں۔ وہ ذاتی عمل کے بجائے پیغمبر کی امت سے گروہی وابستگی ہی کو نجات کے لئے کافی سمجھ لیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے یہود کا یہی حال ہو چکا تھا جو اپنے آپ کو موسیٰ کی امت سمجھتے تھے۔ تاہم یہ صرف یہود کی صفت نہیں ہے بلکہ وہ اس زوال کا نتیجہ ہے جو ہر امت پر لازماً پیش آتا ہے اور قرآن اور حدیث کے بیان کے مطابق خود امت مسلمہ پر بھی پیش آنے والا ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اس معاملہ میں خود مسلمانوں کے ساتھ بھی خدا کا قانون وہی ہے جو کہ یہود کے ساتھ تھا۔

امت مسلمہ کے ساتھ بھی یہی پیش آئے گا کہ پہلی نسل میں اس کے افراد زندہ ایمان کے حامل ہوں گے۔ ان کا سارا انحصار عمل صالح پر ہوگا۔ ان کی ساری توجہ اس پر رہے گی کہ وہ

دنیا میں سچے ایمان اور حقیقی عمل کا ثبوت دیں تا کہ آخرت میں وہ خدا کی عدالت میں خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں۔ مگر بعد کی نسلوں میں جب وہ زوال کے شکار ہوں گے تو یہ صورت حال بالکل بدل جائے گی۔

اب آخرت کی کامیابی کو پانے کے لئے صرف خوش فہمیاں ان کو کافی نظر آنے لگیں گی۔ ان کے درمیان طرح طرح کے پراسرار عقیدے پیدا ہو جائیں گے جن کی کوئی اصل قرآن و سنت میں نہ ہو گی۔ مگر جھوٹے قصے کہانیوں اور مفروضہ بزرگوں کے خوش نما اقوال کی بنیاد پر وہ ان پر اس طرح یقین کر لیں گے جیسے کہ وہ براہِ راست آسمان سے ان کے اوپر اتاری گئی ہیں۔ کچھ ظاہری اعمال، کسی بزرگ کی سفارش، کسی بڑے گروہ سے وابستگی، کچھ پاک کلمات کا ورد، حتی کہ نعت خوانی اور قبروں کی زیارت، بس اس قسم کے سستے اور نمائشی اعمال سے وہ یہ امید قائم کر لیں گے کہ وہ ان کو جہنم سے بچانے کے لئے کافی ہو جائیں گے اور ان کو یقینی طور پر جنت کی پر بہار باغوں میں داخل کر دیں گے۔ مگر قرآن کے مطابق، یہ سب بے بنیاد خوش فہمیاں ہیں جو نہ یہود کے کام آنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں کے کام آنے والی۔

اس قسم کی خوش خیالیاں خواہ ان کو کتنے ہی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو، وہ خدا کی میزان عدل میں سراسر بے حقیقت ہیں۔ اللہ کا نظام حد درجہ محکم نظام ہے۔ اس کے یہاں تمام فیصلے حقیقتوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ محض آرزوؤں کی بنیاد پر۔ اللہ کی عدالت میں ہر آدمی کا اپنا عمل دیکھا جائے گا اور جیسا جس کا عمل ہو گا ٹھیک اسی کے مطابق اس کا فیصلہ ہو گا۔ اللہ کے قانون عدل کے سوا کوئی بھی دوسری چیز نہیں جو اللہ کے یہاں فیصلہ کی بنیاد بننے والی ہو۔

4-017

عادلانہ زندگی

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے خوب گواہی دینے والے بنو، چاہے وہ تمہارے یا تمہارے ماں باپ

یا عزیزوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی مال دار ہے یا محتاج تو اللہ تم سے زیادہ دونوں کا خیر خواہ ہے۔ پس تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تم کجی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔(النساء ۱۳۸)

اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں عدل کا نظام یا عدل کی حکومت قائم کرو۔ یہ کوئی سیاسی آیت نہیں ہے۔ اس کا خطاب تمام تر فرد سے ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ فرد مسلم دنیا میں کس طرح رہے۔ اس کے مطابق، ہر شخص کو چاہئے کہ اپنی ذاتی زندگی کو عدل وانصاف کے اصول پر قائم کرے۔ اس معاملے میں وہ اپنا نگراں آپ بن جائے۔

انسان کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایسا معاملہ آتا ہے جس میں ایک راستہ اپنے مفاد اور خواہش کا ہوتا ہے اور دوسرا حق اور انصاف کا۔ جو لوگ اللہ کی طرف سے غافل ہوتے ہیں، جن کو یقین نہیں ہوتا کہ اللہ ہر وقت ان کو دیکھ رہا ہے وہ ایسے موقع پر اپنی خواہش کے رخ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ اس کو کامیابی سمجھتے ہیں کہ حق کی پرواہ نہ کریں اور معاملہ کو اپنے مفاد اور اپنی مصلحت کے مطابق طے کریں۔ مگر جو آدمی اللہ سے ڈرتا ہے، جو اللہ کو اپنا نگراں بنائے ہوئے ہے وہ تمام تر انصاف کے پہلو کو دیکھتا ہے اور وہی کرتا ہے جو حق وانصاف کا تقاضا ہو۔ اس کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس کو موت آئے تو اس حال میں کہ اس نے کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کی ہو، وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر قسط اور عدل پر قائم کئے ہوئے ہو۔

ایسے آدمی کی انصاف پسندی کا جذبہ اتنا بڑھا ہوتا ہے کہ اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ انصاف سے ہٹا ہوا کوئی رویہ دیکھے اور اس کو برداشت کرلے۔ جب بھی ایسا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے کہ ایک شخص دوسرے کے ساتھ ناانصافی کر رہا ہو تو وہ ایسے موقع پر حق کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتا۔ اگر انصاف کا اعلان کرنے میں اس کے قریبی تعلق والوں پر زد پڑتی ہو، اس کی اپنی مصلحتیں مجروح ہوتی ہوں تب بھی وہ وہی کہتا ہے جو انصاف کی رو سے اسے کہنا چاہئے۔ اس کی زبان کھلتی ہے تو اللہ کے لئے کھلتی ہے نہ کہ کسی اور چیز کے لئے۔ اسی طرح یہ بات

بھی خلاف عدل ہے کہ صاحب معاملہ طاقت ور ہو تو اس کو اس کا حق دیا جائے اور اگر صاحب معاملہ کمزور ہو تو اس کا حق اس کو نہ دیا جائے۔ مومن وہ ہے جو ہر آدمی کے ساتھ انصاف کرے خواہ وہ زور آور ہو یا کمزور۔

جب کوئی آدمی ناانصافی کا ساتھ دے تو وہ یہ کہہ کر ایسا نہیں کرتا کہ میں ناانصافی کرنے والے کا ساتھی ہوں۔ بلکہ وہ اپنی ناانصافی کو انصاف کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ دو میں ایک رویہ اختیار کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ کرتا ہے کہ اصل بات کو بدل دیتا ہے۔ وہ معاملہ کی نوعیت کو ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ یہ ناانصافی کا معاملہ نہیں بلکہ عین انصاف کا معاملہ ہے، جس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ ایسا کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی خاموشی اختیار کرلے۔ یہ جانتے ہوئے کہ یہاں ناانصافی کی جارہی ہے۔ وہ اس کے معاملے میں غیر جانب دار بن جائے۔ اور جو کہنے کی بات ہے اس کو وہ زبان پر نہ لائے۔ اس قسم کا طرز عمل ثابت کرتا ہے آدمی اپنے اوپر اللہ کو نگراں نہیں سمجھتا۔ وہ اس آنے والے دن سے بے فکر ہے جب کہ خدا اس کو پکڑے گا اور اس سے اس کے قول اور فعل کا حساب لے گا۔

5-018

استحکام دین

ہجرت کے دسویں سال قرآن کی وہ آیت اتری جس کو تکمیل دین کی آیت کہا جاتا ہے۔

وہ آیت یہ ہے: الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لک دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً (المائدہ ۳)

یعنی آج انکار کرنے والے لوگ تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کرلیا۔

اس آیت میں تکمیل سے مراد فہرست احکام کی تکمیل نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی قرآن میں کئی احکام اترے۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی،٦/٦٢)

مزید یہ کہ اس آیت میں تکمیل دین کا فائدہ بتاتے ہوئے یہ نہیں کہا گیا کہ اب تم کو ہر حکم قرآن میں مل جائے گا کیوں کہ سارے ممکن احکام قرآن میں اتار دیے گئے ہیں۔ بلکہ اس کے بجائے یہ کہا گیا کہ اب منکرین اور مخالفین اس سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ تمہارے خلاف کچھ کر سکیں۔ اب تمہارے لئے خشیت (ڈر) کا مسئلہ خدا کی طرف سے ہے نہ کہ انسانوں کی طرف سے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں تکمیل دین سے مراد دین کا استحکام ہے نہ کہ فہرست احکام کی تکمیل۔ جب یہ آیت اتری اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور عرب کے تمام قبائل مدینہ کی اسلامی ریاست کے تحت آ چکے تھے۔ مشرک کی مغلوبیت اور توحید کے غلبہ کا مقصد پوری طرح حاصل ہو چکا تھا۔ اس طرح واضح ہو گیا تھا کہ اسلام ایک مستحکم دین کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ اس سلسلے میں یہاں دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں:

وقیل : "اکملت لکم دینکم" بأن اھلکت (لکم) عدوکم و اظھرت دینکم علی الدین کلہ کما تقول: قد تم لنا ما نرید اذا کفیت عدوک۔(تفسیرالقرطبی٦/٦٢)

یئسوا من دینکم ان یغلبوہ لان اللہ تعالی وفی بوعدہ من اظھارہ علی الدین کلہ......

(اکملت لکم دینکم) بأن کفیتم خوف عدوکم و أظھرتکم علیھم کما یقول الملوک الیوم کمل لنا الملک أی کفینا من کنا نخافہ(تفسیر النسفی ١/٢٧٠)

یعنی اللہ نے دین اسلام کو اس طرح کامل کر دیا کہ اسلام کے دشمن ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے اور دین اسلام کو تمام دینوں کے اوپر غالب کر دیا۔ اب دشمن تمہارے بارے میں مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ اس دین کو مغلوب کر سکیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ لوگ کہتے ہیں کہ آج ہمارا

اقتدار مکمل ہو گیا یعنی آج ہمارے دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔

دین اسلام کے مستحکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اس طرح محفوظ ہو چکا ہے کہ اس کی محفوظیت کے لئے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ دنیا کے انقلابات اب کبھی بھی اسلام کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ دنیا کی کوئی بھی علمی ترقی اسلام کی صداقت کو مشتبہ نہ کر سکے گی۔ بعد کے زمانے کی دریافتیں اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے والی ہوں گی نہ کہ اس کی تردید کرنے والی۔ ہر دور میں اسلام کو ایسے حامی اور مددگار ملتے رہیں گے جو اس کو ایک سچے دین کی حیثیت سے زندہ رکھیں، وغیرہ۔

قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ایک کھلا ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے کا ایک اعلان ہر قسم کے اختلاف کے باوجود اپنی معنویت کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ یہ اعلان استثنائی طور پر ابدی اعلان بنا ہوا ہے۔

5-019

مومن کی پہچان

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس کے اس عہد کو یاد کرو جو اس نے تم سے لیا ہے۔ جب کہ تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا۔ اے ایمان والو، اللہ کے لئے قائم رہنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ کو خبر ہے جو تم کرتے ہو۔ (المائدہ ۷-۸)

ایمان ایک عہد ہے جو بندے اور خدا کے درمیان قرار پاتا ہے۔ بندہ یہ وعدہ کرتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق رہے گا۔ بندے کو اپنے عہد میں پورا اترنے کے لئے دو باتوں کا ثبوت دینا ہے۔ ایک یہ کہ وہ قوام للہ بن جائے۔ یعنی وہ خدا کی باتوں پر خوب قائم رہنے والا ہو۔ اس کا وجود ہر موقع پر صحیح ترین جواب پیش کرے جو بندے کو اپنے رب کے لئے پیش کرنا چاہئے۔

وہ جب کائنات کو دیکھے تو اس کا ذہن خدا کی قدرتوں اور عظمتوں کے تصور سے سرشار ہو جائے۔ وہ جب اپنے آپ کو دیکھے تو اس کو اپنی زندگی سراپا اللہ کا فضل اور اس کا احسان نظر آئے۔ اس کے جذبات امڈیں تو خدا کے لئے امڈیں۔ اس کی توجہات کسی چیز کو اپنا مرکز بنائیں تو خدا کو بنائیں۔ اس کی محبت خدا کے لئے ہو۔ اس کے اندیشے خدا سے وابستہ ہوں۔ اس کی یادوں میں خدا سمایا ہوا ہو۔ وہ خدا کی عبادت واطاعت کرے۔ خدا کے راستہ میں اپنے اثاثہ کو خرچ کرے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے دین کے راستہ میں لگا کر خوش ہوتا ہو۔

عہد پر قائم رہنے کی دوسری شرط بندوں کے ساتھ انصاف ہے۔ انصاف کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ کمی بیشی کئے بغیر وہ سلوک کرنا جس کا وہ باعتبار واقعہ مستحق ہے، معاملات میں حق کو اپنانا نہ کہ اپنی خواہشات کو۔ اس معاملہ میں بندے کو اتنا زیادہ پابند بننا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اپنے کو انصاف سے باندھے رہے جب کہ وہ دشمنوں اور باطل پرستوں سے معاملہ کر رہا ہو، جب کہ شکایتیں اور تلخ یادیں اس کو انصاف کے راستہ سے پھیرنے لگیں۔

دنیا میں خدا نشانیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی ایسے دلائل کی صورت میں جس کی کاٹ آدمی کے پاس موجود نہ ہو۔ جب آدمی کے پاس خدا کی دلیل آئے اور وہ اس کو ماننے کے بجائے اس پر لفظی تکرار کرنے لگے تو اس نے خدا کی نشانی کو جھٹلایا۔ ایسے لوگ خدا کے یہاں سخت سزا پائیں گے۔ اور جن لوگوں نے اس کو مان لیا وہ خدا کے انعام کے مستحق ہوں گے۔

5-020

اُمر بالمعروف نہی عن المنکر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ـــــــ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی، داؤد اور ابن مریم کی زبان سے۔ اس لئے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اس برائی سے جو وہ کرتے تھے۔ نہایت برا کام تھا جو وہ کر رہے تھے۔ (المائدہ ۷۸-۷۹)

لعنت کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے دور ہونا۔ قرآن یا حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت داؤد یا حضرت مسیح نے بنی اسرائیل سے یہ کہا ہو کہ اے بنی اسرئیل تم پر لعنت ہو، یا یہ کہ تم لوگ ملعون ہو۔ ایسی حالت میں سوال یہ ہے کہ ان پیغمبروں کے ذریعہ بنی اسرائیل پر جو لعنت کی گئی اس کی صورت کیا تھی۔

قرآن وحدیث نیز بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کو ایکسپوز (expose) کر دیا۔ یعنی وہ اندر سے دینی اسپرٹ سے خالی ہو چکے تھے لیکن اوپر سے وہ دین داری کا شاندار لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان پیغمبروں نے یہ کیا کہ ان کی اس منافقت اور نمائشی دینداری کا پردہ کھول دیا۔ اور انھیں بتایا کہ اس قسم کی بے روح مذہبیت خدا کے یہاں کچھ کام آنے والی نہیں ہے۔

بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے زوال کے زمانے میں بالکل بے دین نہیں ہو گئے تھے۔ ان کے یہاں تورات کو پڑھنے اور پڑھانے کے ادارے قائم تھے ان کے یہاں نماز (عبادت) بھی موجود تھی۔ وہ زرعی پیداوار میں عشر نکالتے تھے۔ ان کے علماء عوام کے سامنے مذہبی موضوعات پر خوش نما تقریریں کرتے تھے۔ اس قسم کی بہت سی مذہبی سرگرمیاں ان کے درمیان جاری تھیں۔ مگر انھوں نے ایک خدائی حکم کو بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ وہ ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ یعنی اپنی قوم کے لوگوں کو برائیوں سے منع کرنا اور انھیں ظلم کو چھوڑ کر عدل کا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کرنا۔

یہودی علماء چاہتے تھے کہ وہ اپنی قوم کے درمیان اچھے بنے رہیں۔ انھیں قوم کے اوپر سیادت حاصل رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو برائی اور زیادتی کرتے دیکھتے تھے مگر وہ ایسے افراد کی مذمت نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی قوم کے درمیان برے بھی نہ بنیں اور دین کا کریڈٹ بھی انھیں حاصل رہے۔ مگر قرآن وحدیث کی واضح تصریح کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ علماء کو اپنی قوم کی زیادتیوں اور ان کی مفسدانہ کارروائیوں کے خلاف اٹھنا ہوگا۔ اس

کے بغیر صرف اوپری قسم کی دین داری یار واد ارانہ قسم کی مذہبیت ان کو خدا کی پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

5-021

جنت کی قیمت

قرآن میں ایک صالح گروہ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ (المائدہ ۸۳۔۸۵)

ان آیات کے مطابق، اللہ نے مذکورہ گروہ کے لئے جنت کا فیصلہ فرمایا۔ اور یہ فیصلہ ان کے ایک قول کی بنا پر تھا (فاثابهم الله بما قالوا جنت)۔ یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ جس شخص نے کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہو گا۔ (من قال لا اله الا الله دخل الجنة)

اس آیت میں جنت کو "قول" کا بدلہ قرار دیا گیا ہے۔ مگر وہ قول کیا تھا جس نے اس کے قائلین کو ابدی جنت کا مستحق بنایا۔ وہ قول ان کی پوری ہستی کا نمائندہ تھا۔ وہ ان کی شخصیت کے اندر کی آواز تھا۔ انھوں نے اللہ کے کلام کو اس طرح سنا کہ اس کے اندر جو حق تھا اس کو وہ پوری طرح پاگئے۔ وہ ان کے دل و دماغ میں اتر گیا۔ اس نے ان کے اندر ایسا انقلاب برپا کیا کہ ان کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز بدل گیا۔ تعصب اور مصلحت کی تمام دیواریں ڈھ پڑیں۔ انھوں نے حق کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح شامل کیا کہ اس سے الگ ان کی کوئی ہستی باقی نہ رہی۔ وہ اس کے گواہ بن گئے، اور گواہ بننا ایک حقیقت کا انسان کی صورت میں مجسم ہونا ہے۔ قرآن اب ان

کے لئے محض ایک کتاب نہ رہا بلکہ مالک کائنات کی زندہ نشانی بن گیا۔ یہ ربانی تجربہ جوان پر گزرا بظاہر اس کا اظہار اگرچہ لفظوں کی صورت میں ہوا تھا لیکن ان کے یہ الفاظ الفاظ نہ تھے بلکہ وہ ایک زلزلہ تھا جس نے ان کے پورے وجود کو ہلا دیا۔ حتی کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ پڑیں۔

قول اپنی حقیقت کے اعتبار سے کسی قسم کے لسانی تلفظ کا نام نہیں۔ وہ آدمی کے عمل کو معنویت کا روپ دینے کی اعلیٰ ترین صورت ہے جس کا اختیار معلوم کائنات میں صرف انسان کو حاصل ہے۔ ایک حقیقی قول سب سے زیادہ لطیف اور سب سے زیادہ بامعنیٰ واقعہ ہے۔ قول آدمی کی ہستی کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ قول گویا ایک ناطق عمل ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص قول کی سطح پر اپنی عبدیت کا ثبوت دے دے تو وہ جنت کا یقینی استحقاق حاصل کر لیتا ہے۔

سچا قول بلاشبہہ سب سے بڑا عمل ہے۔ انسان جیسی ایک آزاد اور بااختیار مخلوق کی زبان سے ایک حقیقی کلمۂ اعتراف اتنا عظیم ہے کہ زمین و آسمان کی عظمت بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کا ایک قول بندے کی طرف سے اپنے رب کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔ اور جنت اسی نادر تحفہ کا خدائی انعام۔

6-022

قانون التباس

منکرین کے ایک مطالبہ کے جواب میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کے اوپر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا پھر انھیں کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔ (الانعام ۸۔۹)

پیغمبر کے معاصرین نے پیغمبر سے کہا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کے پاس خدا کا فرشتہ خدا کی وحی لے کر آتا ہے تو یہ فرشتہ پوشیدہ طور پر کیوں آتا ہے، اس کو علانیہ طور آپ کے پاس آنا چاہئے تاکہ ہم اس کو دیکھیں اور پھر آپ پر ایمان لانا ہمارے لئے آسان ہو جائے۔ اس کے

جواب میں کہا گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس دنیا میں انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ غیب کی حالت میں رہتے ہوئے ایمان لائے۔ خدا کو وہ ایمان مطلوب ہی نہیں جو سب کچھ دیکھ لینے کے بعد وجود میں آیا ہو۔

اس سنت الہٰی کی بنا پر موجودہ دنیا میں ہر چیز کے ساتھ ایک شبہہ کا عنصر (element of doubt) شامل رکھا گیا ہے۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ انسان کو حقیقتیں غیر برہنہ صورت میں دکھائی جائیں۔ اور پھر وہ اپنی عقل اور بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے ان کو برہنہ صورت میں دریافت کرے اور ان پر ایمان لائے۔

اس دنیا میں دعوت حق کا سارا معاملہ خدا کے قانون التباس پر مبنی ہے۔ یہاں حق کے اوپر شبہہ کا ایک پہلو ہمیشہ باقی رہتا ہے تاکہ آدمی اقرار کے دلائل کے ساتھ کچھ انکار کے وجوہ بھی پا سکتا ہو۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ اس شبہہ کے پردے کو پھاڑ کر اپنے کو یقین کے مقام پر پہنچائے۔ وہ شبہہ کے پہلوؤں کو حذف کر کے یقین کے پہلوؤں کو لے لے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ دیکھے بغیر مانے۔ جب حقیقت کو دکھا دیا جائے تو اس کے بعد ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔

انسان موجودہ کائنات میں ایک غیر معمولی قسم کی مخلوق ہے۔ اس کو استثنائی طور پر عقل اور تمیز کی صلاحیت دی گئی ہے۔ وہ اپنی بصیرت سے حق اور ناحق کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ ظاہر میں باطن کو دریافت کرے۔ وہ دیکھے بغیر ان چیزوں کو جان لے جو بظاہر دکھائی نہیں دیتیں۔

انسان کی یہ خصوصی صلاحیت اس کی آزمائش کے عین مطابق ہے۔ اس دنیا میں انسان سے عین وہی امتحان لیا جا رہا ہے جس کا اہل بنا کر اس کو پیدا کیا گیا۔ ایسی حالت میں حقیقتوں کے ساتھ شبہہ کا عنصر ہونا انسان کے لئے کوئی عذر نہیں۔ اس کو بہر حال یہ کرنا ہے کہ شبہہ کے باوجود حقیقتوں کو پہچانے۔ جو آدمی اس امتحان میں ناکام ہو جائے اس کو کوئی بھی چیز آخرت کی پکڑ سے بچانے والی نہیں۔

یہ امتحان سب سے زیادہ داعیٔ حق کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ حق کا داعی ہمیشہ اپنے ہم زمانہ لوگوں کو ایک عام انسان کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی یہ تصویر لوگوں کو اکثر شبہہ میں مبتلا رکھتی ہے۔ داعی کی زندگی اور اس کے کلام میں واضح طور پر یہ ثبوت ہوتا ہے کہ وہ حق کا داعی ہے لیکن لوگ شبہات میں پڑ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ داعیٔ حق کے ساتھ اس کے معاصرین کا یہ سلوک بلاشبہ ایک ناقابل معافی جرم ہے، کوئی بھی عذر انہیں اس کوتاہی سے بری الذمہ کرنے والا نہیں۔

6-023

نتیجہ کی اہمیت

قرآن میں اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ (الانعام ۱۰۸)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک ایسا کام کرنا جائز نہیں جو بظاہر درست نظر آئے مگر وہ الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (counter-productive) ہو۔ کسی اقدام کے وقت صرف اس کی اصولی حیثیت نہیں دیکھی جائے گی بلکہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ عملی طور پر اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر عملی نتیجہ الٹی صورت میں نکلے تو فرض کے درجہ میں ضروری ہوگا کہ اہل ایمان اس سے مکمل طور پر پرہیز کریں۔

مشرکین کے بتوں یا ان کے مذہبی اکابر کو برا کہا جائے تو بظاہر یہ کوئی غلط بات نہیں۔ لیکن کوئی گروہ جب لمبی مدت سے ایک عمل کو مقدس سمجھ کر کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اس کی عصبیتیں جڑ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اہل ایمان ان کو برا کہیں تو وہ مشتعل ہو جائیں گے اور جذبات سے مغلوب ہو کر اسلامی شخصیتوں، حتی کہ خود خدا کو برا کہنے لگیں گے۔ اس لئے اہل ایمان کو چاہئے کہ

وہ اس قسم کی برائی پیدا کرنے کا سبب نہ بنیں۔

ممانعت کا یہ حکم تنقیص یا سب و شتم کے لئے ہے۔ جہاں تک دلیل پر مبنی تنقید و تجزیہ کا تعلق ہے، وہ اسلام میں نہ صرف جائز بلکہ مطلوب ہے۔ قرآن میں اور رسول اللہ کے کلام میں اس کے واضح نمونے موجود ہیں۔

6-024

زندہ انسان

قرآن میں ہدایت پائے ہوئے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ لوگوں میں چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، وہ اس سے نکلنے والا نہیں۔ اس طرح منکروں کی نظر میں ان کے اعمال خوش نما بنا دیئے گئے ہیں۔ (الانعام ۱۲۲)

اس آیت میں مومن اور غیر مومن کا فرق زندہ انسان اور مردہ انسان کی مثال کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ جس آدمی کو حق نہ ملا ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر حقیقی افکار اور تعصبات میں گھرا ہوتا ہے۔ حق بات سامنے آئے تو وہ حق پر غور کرنے کے بجائے اس کو پیش کرنے والے کی شخصیت کو دیکھے گا اور جب وہ اس کو غیر اہم نظر آئے گی تو وہ اس کی بات کو نظر انداز کر دے گا۔

اس طرح اس کے ذہن پر اپنے مادی مفادات کا غلبہ ہوگا جب اس کو دکھائی دے گا کہ حق کا ساتھ دینے میں اس کے مفادات مجروح ہو رہے ہیں تو وہ مفادات کو بڑی چیز سمجھ کر لے لے گا اور حق کو چھوٹی چیز سمجھ کر اسے چھوڑ دے گا۔ ایک خاص گروہ سے لمبی مدت تک وابستہ رہنے کی بنا پر وہ متعصبانہ حد تک اس سے جڑ جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب کسی اور گروہ سے اس کا تعارف ہوگا تو خواہ وہ کتنا ہی برحق ہو مگر اپنے گروہ کے مقابلے میں دوسرے گروہ کی صداقت اس کو نظر نہ آئے گی۔

یہ تقریباً وہی حالت ہے جس کو مقید سوچ (conditioned thinking) کہا جاتا ہے۔

آدمی لمبی وابستگی کے بعد ایک خاص روش سے اتنا زیادہ مانوس ہو جاتا ہے کہ وہ بس اسی میں جینے لگتا ہے۔ اس کے باہر کسی چیز کی اہمیت اسے نظر نہیں آتی۔ یہی وہ شخص ہے جس کو قرآن میں مردہ انسان کہا گیا ہے۔ ایسا انسان حیاتیاتی اعتبار سے زندہ مگر وہ شعور کے اعتبار سے مزدہ ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں دوسرا انسان وہ ہے جس کی فطرت ابھی زندہ تھی اس کے سامنے حق آیا تو اس نے کھلے ذہن سے اس پر غور کیا۔ یہاں تک کہ حق اس کے قلب اور روح میں اتر گیا۔ حق کو پانے کے بعد اس کا حال ایسا ہوا جیسے ایک سوکھا درخت پانی ملنے کے بعد ہرا بھرا ہو جائے۔ حق نے اس کو حیوان کی سطح سے بلند کر کے حقیقی انسان کی سطح پر پہنچا دیا۔

اب اس کا حال یہ ہو گیا کہ اس کی پوری زندگی حق کی روشنی میں گزرنے لگی۔ ایک طرف اس کا ذہن صحیح سمت میں ارتقاء کرنے لگا۔ صبح و شام کے روحانی تجربات اس کی شخصیت کی مثبت تعمیر کرنے لگے۔ اس کی زندگی بااصول انسان کی زندگی بن گئی۔ دوسری طرف وہ اپنے ماحول میں ایک روشنی کی مانند بن گیا۔ وہ لوگوں کو حق کا راستہ دکھانے لگا۔ اس کو ایک ایسا ربانی مشن مل گیا جس کے لئے وہ اپنی ساری عمر کام کرتا رہے۔

اس تقسیم میں پہلا انسان گویا ایک مردہ انسان ہے، اور دوسرا انسان حقیقی معنوں میں ایک زندہ انسان۔ جو آدمی حیوانیت کی سطح پر جئے وہ آدمیت کی حیثیت سے ایک مردہ انسان بن گیا۔ اور جو آدمی حیوانیت سے بلند ہو کر انسانیت کی سطح پر جی رہا ہو، وہی اس قابل ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں زندہ انسان کہا جائے۔

6-025

ہدایت اور ضلالت

ہدایت اور گمراہی کا اصول قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اللہ جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت دے تو اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔ اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے تو اس کے سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، جیسے کہ اس کو آسمان پر چڑھنا پڑ رہا ہو۔ اس طرح اللہ گندگی ڈال

دیتا ہے ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے۔ (الانعام ۱۲۵)

اس آیت میں بظاہر ہدایت اور ضلالت کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر حقیقۃً اس کی نسبت انسانی فطرت کی طرف ہے جو ہر ایک کو خدا کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ جو آدمی اپنی فطرت کو اس کی اصل حالت پر باقی رکھے اس کے لئے اس کی فطرت ایک خدائی رہنما بن جائے گی۔ اس کے بر عکس جو آدمی اپنی فطرت کو بگاڑ دے یا اس کو کند کر ڈالے وہ فطرت کی رہنمائی سے محروم ہو کر گمراہیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

حق اپنی ذات میں اتنا واضح ہے کہ اس کا سمجھنا کبھی کسی آدمی کے لئے مشکل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی ہر زمانہ میں بے شمار لوگ حق کی وضاحت کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ان کے اندر کی وہ رکاوٹیں ہیں جو وہ اپنی نفسیات میں پیدا کر لیتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مقدس ہستیوں سے اتنا زیادہ وابستہ کر لیتا ہے کہ ان کو چھوڑتے ہوئے اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ کسی کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی مصلحتوں کا نظام ٹوٹنے کا اندیشہ اس کے اوپر اتنا زیادہ چھا جاتا ہے کہ اس کے لئے حق کی طرف اقدام کرنا ممکن نہیں رہتا۔ کسی کو نظر آتا ہے کہ حق کو ماننا اپنی بڑائی کے مینار کو اپنے ہاتھ سے ڈھا دینا ہے۔ کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ ماحول کے رواج کے خلاف ایک بات کو اگر میں نے مان لیا تو میں سارے ماحول میں اجنبی بن کر رہ جاؤں گا۔ اس طرح کے خیالات آدمی کے اوپر اتنا مسلط ہو جاتے ہیں کہ حق کو ماننا اس کو ایک بے حد مشکل بلندی پر چڑھائی کے ہم معنی نظر آنے لگتا ہے جس کو دیکھ کر ہی آدمی کا دل تنگ ہونے لگتا ہے۔

اس کے بر عکس معاملہ ان لوگوں کا ہے جو نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا نہیں ہوتے، جو حق کو ہر دوسری چیز سے اعلیٰ سمجھتے ہیں۔ وہ پہلے سے سچے متلاشی بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے جب حق ان کے سامنے آتا ہے تو بلا تاخیر وہ اس کو پہچان لیتے ہیں۔ تمام عذرات اور اندیشوں کو نظر انداز کر کے وہ اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

خدا اپنے حق کو نشانیوں (اشاراتی حقائق) کی صورت میں لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے دلوں میں کمزوریاں لئے ہوئے ہیں وہ ان اشارات کی خود ساختہ تاویل کر کے اپنے لئے اس کو نہ ماننے کا جواز بنا لیتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے سینے کھلے ہوتے ہیں وہ اشارات کو ان کی اصل گہرائیوں کے ساتھ پالیتے ہیں۔ اور ان کو اپنے ذہن کی غذا بنا لیتے ہیں۔ ان کی زندگی فی الفور اس سیدھے راستہ پر چل پڑتی ہے جو خدا کی براہ راست رہنمائی میں طے ہوتا ہے اور بالآخر آدمی کو ابدی کامیابی کے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

6-026

حجت بالغہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جنھوں نے شرک کیا وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا کرتے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کر لیتے۔ اس طرح جھٹلایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے قبل ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے ہمارا عذاب چکھا۔ کہو کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو۔ تم تو صرف گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل سے کام لیتے ہو۔ کہو کہ حجت بالغہ (دلیل محکم) تو اللہ کی ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔ (الانعام ۱۴۸۔۱۴۹)

موجودہ دنیا کو اس کے خالق نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں حقیقی دلیل صرف توحید کے لئے ہو، شرک والحاد کے لئے اس دنیا میں ظن وقیاس کے سوا کوئی اور چیز نہ پائی جائے۔ انسان کی پوری فکری تاریخ قرآن کے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔

مثلاً کچھ لوگوں نے شرک کا عقیدہ گھڑا اور اس کے ثبوت میں یہ کہا کہ دنیا کے مظاہر میں جب تعدد ہے تو اس دنیا کا خدا بھی کئی ہونا چاہئے۔ لیکن جب انسانی علم بڑھا اور دنیا کے بارے میں زیادہ واقفیت حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تعدد محض ظاہری ہے۔ دنیا کی تمام مختلف چیزیں آخر کار ایک ہی مادی اکائی (ایٹم) سے تشکیل پا کر بنیں۔ حتی کہ پوری وسیع کائنات ایک ہی فطری قانون

کے تحت چل رہی ہے۔ اس طرح مشرکانہ فکر آخر کار ایک فرضی قیاس ثابت ہوا، اور موحدانہ فکر کے بارے میں علمی طور پر ثابت ہوا کہ وہ محکم دلیل کی بنیاد پر قائم ہے۔

اسی طرح خدا کے وجود پر شک ظاہر کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے کہا کہ اگر خدا نے کائنات کو پیدا کیا ہے تو خدا کو کس نے پیدا کیا۔ لیکن جب علم کا دریا آگے بڑھا تو معلوم ہوا کہ یہ سوال ایک بے بنیاد سوال ہے۔ جدید علم بتاتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے لئے جو انتخاب (choice) ہے وہ بے خدا کائنات (Universe without God) اور با خدا کائنات (Universe with God) میں نہیں ہے بلکہ ہمارے لئے اصل انتخاب با خدا کائنات (Univese with God) یا غیر موجود کائنات (no universe at all) کے درمیان ہے۔ اب چونکہ ہمارے لئے غیر موجود کائنات کا انتخاب ممکن نہیں، اس لئے واحد ممکن صورت یہ ہے کہ ہم خدا کے وجود کا اقرار کریں۔

6-027

حرام و حلال

قران میں ارشاد ہوا ہے: کہو، آؤ میں سناؤں وہ چیزیں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کی ہیں۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تم کو بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ اور بے حیائی کے کام کے پاس نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ اور جس جان کو اللہ نے حرام ٹھہرایا اس کو نہ مارو مگر حق پر۔ یہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں ہدایت فرمائی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار کا ہی ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جس کا اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا

کر دیں گے۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو۔ (الانعام ۱۵۱۔۱۵۳)

یہ باتیں جو ان آیتوں میں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن کے مطابق، خدا کے صراطِ مستقیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اہل دین کو چاہئے کہ وہ انھیں باتوں پر سب سے زیادہ زور دیں۔ اس کے علاوہ دوسری باتوں پر زور دینا گویا شاہراہ سے ہٹ کر اطراف کے چھوٹے راستوں میں بھٹکنا ہے۔ اور جو لوگ اِدھر اُدھر کے راستوں میں بھٹک جائیں وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

6-028

فرق برائے امتحان

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے ایک کا رتبہ دوسرے پر بلند کیا۔ تاکہ وہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے میں۔ تمہارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الانعام ۱۶۵)

دنیا میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان برابری نہیں، سیاسی اعتبار سے بھی اور غیر سیاسی اعتبار سے بھی۔ یہ نابرابری خدا کے تخلیقی نقشہ کی بنا پر ہے، وہ کوئی خرابی یا برائی نہیں ہے۔ نابرابری کا یہ نظام نہ ہو تو لوگوں کی آزمائش نہیں کی جا سکتی۔ اسی نابرابری کی وجہ سے وہ تمام حالات پیدا ہوتے ہیں جو لوگوں کے لئے آزمائش کا پرچہ بن سکیں۔

دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک شخص جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا ہے۔ ایک قوم پیچھے ہٹا دی جاتی ہے اور دوسری قوم اس کے بجائے زمین کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ واقعہ بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہاں کسی کا اقتدار دائمی نہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو زمین پر موقع ملتا ہے تو وہ گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے ظلم اور سرکشی کو جائز ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے دلائل گھڑ لیتا ہے۔ مگر جب خدا حقیقتوں کو برہنہ کرے گا تو آدمی دیکھے گا کہ اس کی ان باتوں کی کوئی قیمت نہ تھی جن کو وہ اپنے موقف کے جواز کے لئے مضبوط دلیل سمجھے ہوئے تھا۔

دنیا میں آدمی کی سرکشی کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے حق میں خدا کا انعام سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور انعام۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر انعام سمجھے تو اس کے اندر فخر پیدا ہوگا اور اگر وہ ان کو آزمائش سمجھے تو اس کے اندر عجز پیدا ہوگا۔ فخر کی نفسیات سرکشی پیدا کرتی ہے اور عجز کی نفسیات اطاعت۔

7-029

شیطان کی پیروی

قرآن میں انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لئے تو مجھے مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لئے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔ (الاعراف ۱۱-۱۸)

خدا نے انسان کو اس دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس لئے دیا ہے کہ اس کا نفسیاتی جواب وہ شکر کی صورت میں پیش کرے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جس کو آدمی اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس کے اندر دوسرے دوسرے جذبات ابھار کر اس کو شکر کی نفسیات سے دور کر دیتا ہے۔

آدم اور ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کا معرکہ کہاں برپا ہوتا ہے۔ یہ معرکہ ان مواقع پر برپا ہے جہاں آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگتی ہیں۔ امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پالیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لئے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا اعتراف کرنا اس کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا کرنے کے ہم معنی ہے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ "میں بہتر ہوں" کے احساس کی بنا پر وہ دوسرے کے فضل کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستہ پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ اور بے اعترافی کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے کو جہنمی انجام کا مستحق بنالیا جو شیطان کے لئے مقدر ہے اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کئے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے۔

اس دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کسی کی فضیلت کا اعتراف دراصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے اور اس کی فضیلت کو نہ ماننا خدا کی تقسیم کو نہ ماننا ہے۔ اس طرح جب ایک شخص کسی حق کی بنا پر دوسرے کے آگے جھکتا ہے تو وہ کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیوں کہ ایسا وہ خدا کے حکم کی بنا پر کر رہا ہے نہ کہ اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔ شکر تمام نیکیوں کی جڑ ہے اور کبر تمام برائیوں کی جڑ۔ یہی وجہ ہے کہ شکر سب سے بڑی عبادت ہے اور کبر سب سے بڑا گناہ۔

7-030

پیغمبر صالح کی مثال

حضرت صالح ایک پیغمبر تھے جو قوم ثمود کی طرف بھیجے گئے۔ قوم ثمود نے حضرت صالح

کے ساتھ سرکشی کی۔ اس سلسلے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے: پھر انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے۔ اور انھوں نے کہا، اے صالح اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے تھے۔ پھر انھیں زلزلہ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھر میں اوندھے منھ پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتے ہوئے ان کی بستی سے نکل گئے کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے (الاعراف ۷۷۔۷۹)

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ قوم کا صرف ایک سرکش آدمی تھا۔ مگر یہاں اس کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا "ان لوگوں نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا" اس سے معلوم ہوا کہ کسی گروہ کا ایک شخص برا عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کے برے فعل پر راضی رہیں تو سب کے سب اس مجرمانہ فعل میں شریک قرار دئے جاتے ہیں۔

جو قوم خواہش پرستی کا شکار ہو اس کو حقیقت پسندی کی باتیں اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ایسے شخص کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی جو اس کو سنجیدہ عمل کی طرف بلاتا ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ خوش نما الفاظ بولیں اور جھوٹی امیدوں کی تجارت کریں ان کے گرد بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ سچے خیر خواہ کے لئے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ ان لوگوں کی طرف وہ تیزی سے دوڑ پڑتی ہے جو اس کا استحصال کرنے کے لئے اٹھے ہوں ــــ یہی مطلب ہے حضرت صالح کے اس قول کا کہ میں نے تمہارے ساتھ خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

7-031

غفلت، گمراہی کا سبب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے جنات اور انسان میں سے بہتوں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں،

ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ۔ یہی لوگ ہیں غافل۔ (الاعراف۔ ۱۷۹)

اس آیت میں ہدایت اور گمراہی کا فطری قانون بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو آنکھ اور کان دئے ہیں جن کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرے۔ اسی کے ساتھ اللہ نے ہر انسان کو ذہن دیا جس کے ذریعہ وہ باتوں کو سمجھے اور حق اور باطل کے درمیان تمیز کرے۔ لیکن جو لوگ غفلت میں پڑ جائیں ان کو کوئی چیز ہدایت دینے والی نہیں۔

سچائی ایک ایسی چیز ہے جسے ہر آدمی کو خود پانا ہے۔ خدا نے ہر آدمی کو دل اور آنکھ اور کان دئے ہیں۔ آدمی انہی صلاحیتوں کو استعمال کر کے سچائی کو پاتا ہے۔ اور جو شخص ان صلاحیتوں کو استعمال نہ کرے وہ یقیناً سچائی کو پانے سے محروم رہے گا، خواہ سچائی اس سے کتنا زیادہ قریب موجود ہو۔

سچائی کو پانا ہر آدمی کا ایک شعوری اور ارادی فعل ہے۔ سچائی کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے اپنے دل کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھے ہوں۔ اس کو وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اپنی آنکھوں پر مصنوعی پردے نہ ڈالے ہوں۔ اس کی آواز اسی کو سنائی دے سکتی ہے جس نے اپنے کان میں کسی قسم کے ڈاٹ نہ لگا رکھے ہوں۔ ایسے لوگ سچائی کی آواز کو پہچان کر اس کے آگے اپنے کو ڈال دیں گے۔ اور جس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہو وہ چوپایوں کی طرح ناسمجھ بنا رہے گا۔ پہاڑ جیسے دلائل کا وزن محسوس کرنا بھی اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اس کے سامنے خدا کی تجلیاں ظاہر ہوں گی مگر وہ اس کو دیکھنے سے عاجز ہوگا۔ اس کے پاس خدا کا نغمہ چھیڑا جائے گا مگر وہ اس کو سننے سے محروم رہے گا۔ سچائی ہمیشہ بیدار لوگوں کو ملتی ہے۔ غافلوں کے لئے کوئی سچائی نہیں۔

7-032

شیطان کی وسوسہ اندازی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: درگزر کرو۔ نیکی کا حکم دو اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اور اگر تم کو

کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے آئے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ (الاعراف ۱۹۹۔۲۰۰)

اس آیت میں داعی کا کردار بتایا گیا ہے۔ داعی پر لازم ہے کہ وہ مدعو کے مقابلے میں ہمیشہ اعراض اور عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرے۔ اس کے بغیر دعوت کا کام معتدل انداز میں انجام نہیں پاسکتا۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ مدعو کی طرف سے کسی ناخوش گوار رویہ پر داعی کے اندر انتقامی جذبہ بھڑک اٹھے تو ایسے جذبہ کو سراسر شیطانی وسوسہ سمجھنا چاہئے اور اللہ سے توفیق مانگنا چاہئے کہ اس کے سینہ کو اس قسم کے منفی جذبہ سے پاک کر دے۔

7-033

حساسیت ڈھال ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اور جو لوگ شیطان کے بھائی ہیں وہ ان کی گمراہی میں کھنچے چلے جاتے ہیں پھر وہ کمی نہیں کرتے۔ (الاعراف ۲۰۱۔۲۰۲)

متقیانہ حساسیت اس دنیا میں سب سے بڑا چیک ہے۔ آدمی کے اندر اگر یہ حساسیت ہو تو وہ برائیوں سے محفوظ رہے گا اور اگر یہ حساسیت نہ ہو تو کوئی بھی دوسری چیز اس کو برائیوں سے بچانے والی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں ہر شخص نفس اور شیطان کے حملوں کی زد میں ہے۔ ایسی حالت میں جو چیز آدمی کو بچانے والی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ

اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ کے ڈر سے خالی ہوتے ہیں ان کے اندر شیطان داخل ہو کر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ شیطان کے ساتھی بن کر کسی تباہ کن گڑھے کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں آخری حد تک غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔

8-034

مومن کی صفات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ایمان والے لوگ وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل اٹھیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جائیں تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت ہیں اور ان کے لئے عزت کی روزی ہے۔ (الانفال ۲۔۴)

ایمان عظیم ترین حقیقت کی دریافت ہے۔ جب یہ حقیقت کسی آدمی کے سینے میں اترتی ہے تو وہ اس کی پوری شخصیت میں زلزلہ پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے انسان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب اس کو کسی حق کی یاد دلائی جائے تو وہ فوراً ہی اسے قبول کر لیتا ہے۔ خدا کو قادر مطلق کے طور پر دریافت کرنا اس کے اندر فطری طور پر اعتماد کی صفت پیدا کر دیتا ہے۔

ایسے انسان کے اندر فطری طور پر ہر قسم کی اعلیٰ صفات پیدا ہونے لگتی ہیں۔ وہ ایک طرف اللہ کا سچا عبادت گزار بن جاتا ہے اور دوسری طرف بندوں کا سچا دوست اور خیر خواہ۔

خدا کو اس کی عظمت و کمال کے ساتھ دریافت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ایک ایسی دریافت ہے جو آدمی کے اندر سے فخر اور برتری کے تمام احساسات کو مٹا دیتی ہے۔ وہ اس کو حقیقی معنوں میں ایک مومن بنا دیتی ہے، اور حقیقی مومن ہی کا دوسرا نام حقیقی انسان ہے۔

8-035

حق و باطل میں امتیاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اے ایمان والو، اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمہارے لئے فرقان بہم پہنچائے گا۔ اور تم سے تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ (الانفال ۲۹)

متقی انسان وہ ہے جس کے سینہ میں اندیشہ ناک دل ہو جو ایک طرف خدا کی رحمت کا امیدوار ہو اور اسی کے ساتھ اللہ کی پکڑ سے بہت زیادہ ڈرنے لگے۔ ایسا انسان صحیح اور غلط کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو جاتا ہے۔ وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ ایک چیز کو حق جانے اور اس کے باوجود وہ اس کو اختیار نہ کرے۔ اسی طرح وہ اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ ایک چیز کو باطل جانے اور اس کے باوجود وہ اس میں ملوث ہو جائے۔

اس قسم کی اندیشہ ناک نفسیات آدمی کے اندر وہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے جس کو یہاں فرقان کہا گیا ہے۔ یعنی حق اور باطل کے درمیان تمیز کرنے والا۔ جس آدمی کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے وہ اس کے لئے اس بات کی ضامن بن جائے گی کہ وہ ہمیشہ صحیح انداز میں سوچے، اور اپنی عملی روش کے لئے ہمیشہ صحیح رویہ اختیار کرے۔

8-036

صلح کی حکمت

قرآن میں دشمن طاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے پیغمبر اسلام سے کہا گیا ہے: اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔ (الانفال ۶۱۔ ۶۲)

اس سے معلوم ہوا کہ فریق مخالف اگر یہ پیش کش کرے کہ آؤ، ہم مقابلہ آرائی کا طریقہ

چھوڑ کر آپس میں صلح کر لیں تو اہل ایمان کو چاہئے کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لیں۔ اگر بالفرض یہ اندیشہ ہو کہ فریق مخالف کا دل صاف نہیں ہے اور وہ دھوکہ دینے کے ارادے سے ایسا کر رہا ہے تب بھی اہل ایمان کو چاہئے کہ اللہ کے بھروسے پر اس کی پیش کش کو قبول کر لیں۔

اس قرآنی اصول میں ایک اہم حکمت چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ صلح اہل ایمان کو عمل کے میدان سے ہٹاتی نہیں، بلکہ وہ ان کو دوسرے، زیادہ بڑے عمل کی طرف موڑ دیتی ہے۔ اور یہ تعمیر واستحکام کا عمل ہے۔ جنگ ومقابلہ کی حالت میں تعمیری سرگرمیاں رکی رہتی ہیں جب کہ صلح تعمیر کے مواقع کو کھول دینے والی ہے۔ اگر صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والے مواقع کو تعمیر و استحکام کے لئے استعمال کیا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس سے اتنا بڑا مثبت فائدہ حاصل ہو جائے جو جنگ وقتال کے ذریعہ ہرگز ممکن نہیں۔

9-037

دعوت و تبلیغ ہر حال میں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کی امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے۔ (التوبہ ٦)

قرآن کی یہ آیت دور اول کے ان مخالفین اسلام کے بارے میں ہے جو اس زمانے کے مسلمانوں سے برسر جنگ تھے۔ اس کے باوجود انھیں حسب حالات اسلام سے متعارف کرانے کا حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف عام حالت میں بلکہ ہنگامی حالت میں بھی دعوت و تبلیغ کے عمل کو جاری رہنا چاہئے۔

جنگ کے زمانہ میں اگر دشمن کا کوئی فرد یہ کہے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کو امان دے کر اپنے ماحول میں آنے کا موقع دیں اور اسلام کے پیغام سے اس کو متعارف کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود اگر وہ اسلام کی طرف راغب نہ ہو تو

اپنی حفاظت میں اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچادیں۔ بظاہر اگرچہ وہ دشمن گروہ کا ایک فرد ہے مگر یہ درست نہ ہوگا کہ اس کو دشمن سمجھ کر اس کے ساتھ سخت معاملہ کیا جائے۔

جنگ کے زمانہ میں دشمن کو اس کی رعایت دینا انتہائی نازک ہے۔ کیوں کہ عین ممکن ہے کہ دشمن کا کوئی جاسوس اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور ان کے فوجی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اسلام کی نظر میں دعوت و تبلیغ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس نازک خطرہ کے باوجود اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

9-038

جارحیت نہیں

اجتماعی معاہدات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ان مشرکوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے، مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، پس جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ (التوبہ ۷)

قرآن کی اس آیت سے بین اقوامی تعلق کا بنیادی اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ جب تک فریق ثانی باہمی تعلق میں مستقیم رہے اہل ایمان کو بھی ان کے ساتھ مستقیم رہنا چاہئے۔ اگر فریق ثانی اس شرط کو توڑ دے تو اس کے بعد اہل ایمان بھی حسب حال اپنے بچاؤ کے لئے ضروری اقدام کر سکتے ہیں۔

مستقیم ہونے کی دو بڑی صورتیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان باقاعدہ طور پر کوئی تحریری معاہدہ ہوا ہو۔ ایسی حالت میں مستقیم ہونے یا نہ ہونے کا معیار معاہدہ کی یہ تحریر ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی انٹرنیشنل قانون یا رواج موجود ہو جس کو عمومی طور پر قوموں کے درمیان تسلیم کیا جاتا ہو۔ ایسی حالت میں اس بین اقوامی رواج یا قانون کو بھی مسلمہ معیار کی حیثیت حاصل ہوگی جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جائے گا کہ فریقِ ثانی مستقیم ہونے کے

مطلوب معیار پر قائم ہے یا نہیں۔

بین اقوامی تعلقات یا صلح وجنگ کے لئے بھی بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کی تعمیل ہر حال میں مطلوب ہے، کسی بھی حال میں اس کی خلاف ورزی کرنا کسی مسلم گروہ کے لئے جائز نہیں۔

9-039

زوال کی علامت

قدیم اہل کتاب کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: انہوں نے احبار اور اپنے رہبان کو اللہ کے سوا رب بناڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں (التوبہ ۳۱)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی امت زوال کا شکار ہوتی ہے تو اس کے اندر کیا خاص کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایسی امت رسمی طور پر تو خدا کو مانتی ہے مگر عملی طور پر اس کا پورا دین احبار ورہبان کی بنیاد پر قائم ہو جاتا ہے۔ خدا کی کتاب اب ان کے یہاں صرف برکت کی چیز بن جاتی ہے۔ وہ اپنا دین علماء کے اقوال اور بزرگوں کے ملفوظات سے لینے لگتے ہیں نہ کہ حقیقۃً خدا اور اس کے رسول کے کلام سے۔

وہ خدا کی عظمت سے بے خبر ہو کر اپنی کچھ شخصیتوں کو اکابر کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان مفروضہ اکابر کے ارد گرد پر اسرار کہانیوں کا ایک طلسماتی ہالہ بن جاتا ہے۔ ان بے اصل کہانیوں پر لوگ اس طرح یقین کر لیتے ہیں جیسے کہ وہ بالکل واقعہ ہوں۔ ایسے لوگ بظاہر اپنی زبان سے خدا کا انکار نہیں کرتے مگر عملاً وہ اپنے اکابر کو وہی درجہ دے دیتے ہیں جو صرف خدا کا ہونا چاہئے۔ اسی عملی حالت کی بنا پر اس آیت میں انھیں اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا رب بنانے کا مجرم قرار دیا گیا۔

9-040

ایک گروہ ضروری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے

ہوں۔ تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تا کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جاکر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تا کہ وہ بھی پرہیز کرنے والے بنتے۔ (التوبہ ۱۲۲)

اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمانوں میں کم از کم ایک داعی گروہ موجود ہو۔ اس مقصد کے لئے ملت کے اندر ایک باقاعدہ تعلیمی نظام ہونا ضروری ہے، تاکہ نسل در نسل ہر زمانہ میں ایسے دعوتی افراد تیار ہوتے رہیں اور دعوت کے عمل کا تسلسل ہر انسانی نسل میں جاری رہے۔

اس مقصد کے لئے جو تعلیمی نظام بنایا جائے اس کا بنیادی نصاب مذکورہ آیت کے مطابق، دو قسم کے اجزاء پر مشتمل ہونا چاہئے۔ ایک یہ کہ وہ حق کا پورا علم اور اس کے کامل فہم کی استعداد پیدا کرتا ہو۔ دوسرے یہ کہ افراد ان دیگر علوم سے مسلح ہوں جو مدعو قوم کی نسبت سے ضروری ہے۔ مثلاً مدعو کی زبان جاننا اور زمانہ کے افکار سے واقف ہونا، وغیرہ۔

ملت کے اوپر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرے جس کے ذریعہ ہر نسل اور ہر دور میں ایسے داعی افراد تیار ہوتے رہیں۔ کوئی بھی دوسری سرگرمی اس ذمہ داری کا بدل نہیں بن سکتی۔ مثال کے طور پر مسلمان کسی زمانہ میں اس قسم کے داعی گروہ تیار نہ کریں تو وہ اللہ کے یہاں صرف اس لئے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ انہوں نے ہر جگہ عالیشان مسجدیں کھڑی کر دی ہیں۔

10-041

فطرت کا الارم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور انسان کو جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے۔ پھر جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو وہ ایسا ہو جاتا ہے گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گذرنے والوں کے لئے ان کے اعمال خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ (یونس ۱۲)

دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ آدمی بار بار کسی نہ کسی تکلیف یا حادثہ کی زد میں آجاتا ہے۔

جب ایسا ہوتا ہے تو آدمی محسوس کرنے لگتا ہے کہ خارجی طاقتوں کے مقابلہ میں وہ بالکل بے بس ہے۔ اس وقت آدمی بے اختیار ہو کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ وہ خدا کی قدرت کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مگر یہ حالت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ مصیبتوں کی گرفت میں ہو، مصیبت سے نجات پاتے ہی وہ دوبارہ ویسا ہی غافل اور سرکش بن جاتا ہے جیسا کہ وہ اس سے پہلے تھا۔ ایسے لوگوں کے اظہار بندگی کو خدا تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ اظہار بندگی وہ مطلوب ہے جو آزادانہ حالات میں کی جائے، مجبورانہ حالات میں ظاہر کی ہوئی بندگی کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔

حقیقت کی تلاش کا پہلا مرحلہ اپنے عجز کی دریافت ہے۔ آدمی جب اس تجربہ سے گزرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کے بغیر اس کا وجود بالکل بے معنی ہے۔ اس وقت وہ بے تابانہ طور پر خدا کا اعتراف کرنے لگتا ہے۔ مگر اکثر انسانوں کا یہ حال ہے کہ ان کا یہ اعتراف حالات کے دباؤ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً شعوری فیصلہ کے تحت۔ چنانچہ ایسے لوگ حالات بدلنے کے بعد کسی خود ساختہ توجیہ کا سہارا لے کر خدا کو بھول جاتے ہیں اور دوبارہ اپنے آپ کو بے خدا زندگی پر راضی کر لیتے ہیں۔

اس دنیا میں لازمی طور پر حالات کا اتار چڑھاؤ پیش آتا ہے۔ یہ حالات ہر انسان کے لئے قدرت کا الارم ہیں۔ یہ الارم انسان کی سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیتے ہیں۔ خوش قسمت انسان وہ ہے جو فطرت کی اس بیداری سے سچا سبق لے اور اپنی زندگی کو مستقل طور پر خدا پرستانہ زندگی بنا دے۔

10-042

خلافت ارضی

قرآن میں گزری ہوئی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد ان کی جگہ لینے والی نئی قوموں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پھر ہم نے ان کے بعد تم کو ملک میں جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو۔ (یونس ۱۴)

دنیا کی قوموں کا معاملہ سمندر اور پہاڑ جیسا نہیں ہے کہ ایک ہی قوم ہزاروں سال تک زمین پر آباد رہے۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد لوگ مرتے رہتے ہیں اور ایک قوم کے بعد دوسری قوم زمین پر آباد ہوتی ہے اور اپنا اقتدار قائم کرتی ہے۔ اسی انسانی نظام کو قرآن میں خلافت کہا گیا ہے، یعنی ایک کا جانا اور اس کے بعد دوسرے کا اس کی جگہ لینا۔

اس دنیا میں کسی قوم کو خلیفہ (بااقتدار جانشین) بنانا اعزاز کے لئے نہیں بلکہ امتحان کے لئے ہوتا ہے۔ جانشین بنانے کا مطلب ایک کے بعد دوسرے کو کام کا موقع دینا ہے، ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو امتحان کے میدان میں کھڑا کرنا ہے۔

مثال کے طور پر ہندستان میں پہلے مختلف دیسی راجا حکومت کر رہے تھے اس کے بعد ان کی جگہ مغلوں کو یہ منصب دیا گیا۔ پھر ان کو ہٹا کر انگریز ان کے جانشین بنائے گئے۔ اس کے بعد انھیں ملک سے نکال کر اس ملک کے اکثریتی فرقہ کے لئے جگہ خالی کی گئی۔ ان میں سے ہر بعد کو آنے والا اپنے پہلے کا خلیفہ (سیاسی جانشین) تھا۔

خلافت یا سیاسی جانشینی دراصل امتحان کا پرچہ ہے۔ اس دنیا میں آنے والا ہر انسانی گروہ خدا کی طرف سے زیر امتحان ہے۔ ہر گروہ کو بہر حال آزمائش کے مرحلہ سے گزرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں خلافت یا سیاسی اقتدار مستقل طور پر کسی ایک گروہ کو نہیں ملتا بلکہ وہ بار بار بدلتا رہتا ہے تاکہ باری باری ہر ایک کا امتحان لیا جا سکے۔

10-043

شفاء قلب

قرآن میں اس کتاب ہدایت کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے نصیحت (خدا کی کتاب) آگئی اور اس کے لئے شفاء جو سینوں میں ہوتا ہے اور اہل ایمان کے لئے ہدایت اور رحمت۔ (یونس ۵۷)

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنے

دل سے شکایت ہے۔ آپ نے فرمایا تم قرآن پڑھا کرو۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی مذکورہ آیت تلاوت فرمائی (جاء رجل الی النبی ﷺ و قال انی اشتکی صدری ، قال اقرأ القرآن یقول اللہ تعالی وشفاء لما فی الصدور) التفسیر المظہری المجلد الخامس، ۳۵۔

قرآن دل کی بیماری کے لئے شفاء ہے۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی سچا طالب ہو، وہ جب قرآن کو پڑھے گا تو قرآن کے صفحات میں اس کو اپنے ذہنی سوالات کا جواب اور قلبی بیماریوں کا علاج معلوم ہوتا رہے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص کو خدا کے وجود کے بارے میں شک ہے۔ وہ اپنے اس ذہن کو لے کر قرآن کو پڑھنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچتا ہے " أ فی اللہ شکٌ فاطر السموات والارض " (ابراہیم ۱۰) وہ جب اس آیت پر غور کرے گا تو اس کو اس آیت میں خدا کے وجود کا خالص عقلی ثبوت مل جائے گا۔ اس طرح یہ آیت اس کے شک کو یقین میں بدلنے کا ذریعہ بن جائے گی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، تذکیر القرآن، ۵۴۲)

اسی طرح ایک شخص کسی اشتعال انگیز بات پر غضبناک ہو گیا ہے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اب وہ قرآن پڑھنا شروع کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اس آیت پر پہنچتا ہے "واذا ما غضبوا ھم یغفرون" (الشوریٰ ۳۷) جب وہ اس آیت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا تو وہ اس میں زندگی کا ایک نہایت اہم نکتہ پا جائے گا۔ وہ یہ کہ اشتعال انگیزی کا جواب غضبناک ہونا نہیں ہے بلکہ اس کو نظر انداز کر دینا ہے۔ اسی روش میں انسان کی فلاح کا راز چھپا ہوا ہے۔

ایک شخص کو کسی سے ظلم وزیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ ظاہری واقعات کی بناء پر اس کو اپنی محرومی کا ذمہ دار سمجھ لیتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ اس کے خلاف احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم چلائے۔ اب وہ اس معاملہ میں قرآن سے رجوع کرتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت پر پہنچتا ہے " وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم " (الشوریٰ ۳۰) یہ آیت اس کو

جھنجھوڑتی ہے، وہ معاملہ پر از سر نو غور کرنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر کھلتا ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا وہ صرف اس کی داخلی کمی کی بنا پر پیش آیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی مفروضہ دشمن کے خلاف شور و غل کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے سبق لے کر وہ اپنی داخلی کمی کو دور کرنے میں لگ جاتا ہے یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس طرح ایک شخص کے ساتھ کوئی ناخوشگوار تجربہ پیش آتا ہے۔ مثلاً اس کی بیوی بظاہر اس کی پسند کے مطابق نہیں۔ وہ اس طرح کے تجربہ کی تلخ یاد اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن پڑھتا ہے، قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت تک پہنچتا ہے "وعسی ان تکرھوا شیئاً و ھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئاًوھو شر لکم (البقرہ ۲۱۶)

یہ آیت اس کو سوچنے کا ایک نیا رخ دے دیتی ہے۔ اس پر غور کرتے ہوئے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ظاہری پسند اور ظاہری ناپسند کی حیثیت بالکل اضافی ہے۔ محض ظاہر کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ عین ممکن ہے کہ ظاہر کے اعتبار سے کوئی چیز اچھی نہ لگتی ہو، مگر اپنی داخلی حقیقت کے اعتبار سے اس کے اندر کوئی بہت بڑی خوبی موجود ہو۔ جب اس کا ذہن اس طرح سوچے گا تو عین ممکن ہے کہ وہ جس چیز کو بظاہر ناپسندیدہ چیز سمجھے ہوئے تھا، اس کے اندر اس کو کوئی ایسا پسندیدہ پہلو مل جائے جو اتنا زیادہ قیمتی ہو کہ اس کی ظاہری ناپسندیدگی اس کو غیر اہم دکھائی دینے لگے۔

اسی طرح ایک انسان جس کو قلبی سکون حاصل نہیں۔ اس نے محنت کر کے اپنا ایک گھر بنایا۔ اس نے لمبی جدوجہد کے بعد اپنی ایک اقتصادی دنیا تعمیر کی۔ اس نے ایک پسندیدہ خاتون سے نکاح کیا، اس سے اس کے یہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ اس کا گھر بھرپور خاندان والا گھر بن گیا۔ ان سب کے باوجود وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کو حقیقی معنوں میں خوشی اور سکون حاصل نہیں۔ وہ اب بھی اسی بے چینی میں جی رہا ہے۔ اب اس نے قرآن کو پڑھنا شروع کیا۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے وہ اس آیت پر پہنچا: الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ (الرعد ۲۸) یہ آیت اس کو چونکاتی

ہے، وہ اس پر غور کرنا شروع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس پر ایک ایسی حقیقت منکشف ہوتی ہے جس کو وہ اس سے پہلے جانتا نہ تھا۔ وہ یہ کہ سکون کے حصول کا ذریعہ مادی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ اس کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ خدا کا ذکر (یاد) ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک معیار پسند (idealist) مخلوق ہے۔ جب کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے معیار سے کم تر ہیں۔ ہر چیز نقص یا محدودیت کا شکار ہے۔ دنیا کی ہر چیز آدمی کو اس کی طلب سے کم دکھائی دیتی ہے۔ اس کے برعکس خدا آخری حد تک ایک کامل ہستی ہے۔ وہ ہر قسم کے نقص سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی کو سکون صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ وہ خدا کو پالے، وہ اس کی یادوں میں زندگی گزارنے لگے۔

قرآن میں بلاشبہ دلوں کے لئے شفاء ہے، مگر یہ شفاء صرف اس کے لئے ہے جو قرآن سے اپنے لئے رہنمائی کا طالب ہو۔ جو کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھے اور کسی شرط کے بغیر قرآن کے پیغام کو ماننے کے لئے تیار ہو۔ اس دنیا میں کوئی بھی مطلوب چیز صرف اس کے طالب کو ملتی ہے نہ کہ اس کو جو سرے سے اس کا طالب ہی نہیں۔

10-044

اللہ کے اولیاء

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: سن لو، اللہ کے اولیاء کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے، ان کے لئے خوش خبری ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں، اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔ (یونس ۶۲۔۶۴)

اولیاء اللہ، قرآن کے مطابق، کسی پراسرار گروہ کا نام نہیں۔ یہ معلوم انسان ہیں اور ان کی صفات مذکورہ آیت میں بیان کردی گئی ہیں۔ وہ صفات یہ ہیں کہ ــــ وہ صاحب ایمان ہوں، یعنی انہیں معرفت کے درجہ میں اللہ کا تعلق حاصل ہو جائے۔ وہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں وہ

روش اختیار کریں جو اللہ کے خوف کے تحت بنتی ہے۔ یہ صفات جن لوگوں کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں ان کو دنیا ہی میں ایک ربانی زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کی توفیق سے اس راستہ پر چل پڑتے ہیں جس کی آخری منزل جنت ہے۔ یہ اللہ کے اٹل قانون کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں۔

اولیاء اللہ کا لفظ اسی طرح ایک معلوم شرعی لفظ ہے جس طرح مومن اور متقی کا لفظ۔ اولیاء اللہ کا درجہ کسی کو معلوم شرعی قوانین کے ذریعہ ملتا ہے نہ کہ کسی پر اسرار نسبت کے ذریعہ۔

10-045

ہدایت وضلالت

قرآن میں ہدایت وضلالت کا قانون بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کی اجازت کے بغیر ایمان لائے۔ اور اللہ ان لوگوں پر گندگی ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔ (یونس ۱۰۰)

"کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر ایمان نہیں لا سکتا" کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی کو ایمان کی نعمت ملے گی تو اس طریقہ کی پیروی کر کے ملے گی جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ موجودہ دنیا میں ایمان کو پانے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ایمان کی دعوت کو اپنی عقل کے استعمال سے سمجھے۔ اللہ نے انسان کو عقل دی ہے۔ جس شخص کی عقل کے اوپر اس کی دنیوی مصلحتیں غالب آجائیں اس کی عقل گویا گندگی کی کیچڑ میں لت پت ہو گئی ہے۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ایمان کی نعمت پانے کا کوئی امکان نہیں۔

انسان کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز کرے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے سچائی کو دریافت کرے۔ یہی اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق کا راستہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل کو بے آمیز طور پر استعمال کریں گے وہ حق کو پائیں گے۔ اور جو لوگ اپنی خداداد عقل کو بے آمیز طور پر استعمال کرنے میں ناکام رہیں وہ حق کو پانے میں ناکام ہو جائیں گے۔

10-046

جنت والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی، وہی لوگ جنت والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (ہود ۲۳)

آیت میں اخبات کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں عاجزی کرنا۔ عربی میں کہتے ہیں "هو خبيت القلب" (وہ شکستہ دل ہے) یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔ ایمان نہ کوئی وراثت ہے اور نہ کسی لفظی مجموعہ کی لسانی ادائیگی۔ ایمان ایک ذہنی دریافت ہے۔ آدمی جب اپنے سمع وبصر (بالفاظ دیگر شعور) کو استعمال کر کے خدا کو پاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کا ادراک کرتا ہے تو اس وقت اس کے اوپر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اسی کا نام عجز (اخبات) ہے۔ عجز خدا کے مقابلہ میں اپنی حیثیت واقعی کی پہچان کا لازمی نتیجہ ہے۔

ایمان، اخبات اور عمل صالح تینوں ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ ایمان خدا کے وجود اور اس کی صفات کمال کی شعوری دریافت ہے۔ اخبات اس قلبی حالت کا نام ہے جو خدا کی دریافت کے نتیجہ میں لازماً آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ عمل صالح اسی شعور اور اسی کیفیت سے پیدا ہونے والی خارجی صورت ہے۔ آدمی جب خدا کے ذہن سے سوچتا ہے۔ جب اس کا دل خدائی کیفیات سے بھر جاتا ہے تو اس کے عین فطری نتیجہ کے طور پر اس کی ظاہری زندگی خدا کی پسند والے اعمال میں ڈھل جاتی ہے۔ اسی کا نام عمل صالح ہے۔ جو شخص ایمان، اخبات اور عمل صالح کا پیکر بن جائے وہی خدا کا مطلوب انسان ہے۔ اور وہی وہ انسان ہے جس کو جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے گا۔

10-047

سیئات کی تلافی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تم نماز قائم کرو، دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بے شک نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یاد دہانی ہے یاد دہانی حاصل کرنے

والوں کے لئے۔ (ھود، ۱۱۴)

انسان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس سے بار بار غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ وقتی اثرات کے تحت وہ گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کے اندر ضمیر کا مادہ رکھا گیا ہے۔ جب بھی انسان سے کوئی کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کو ملامت کرنے لگتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔

اب انسان کیا کرے۔ ایک طرف بشری تقاضے کے تحت اس سے ایک گناہ سرزد ہو چکا۔ دوسری طرف اس کا ضمیر اندر سے ملامت کر کے اس کو مسلسل بے چین کئے ہوئے ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی مسئلہ کا حل بتایا گیا ہے۔ آدمی اس آیت پر عمل کر کے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اللہ سے اپنے تعلق کو دوبارہ قائم کر سکتا ہے۔

یہ قرآنی تدبیر کیا ہے، یہ ہے برائی کے بعد بھلائی کرنا۔ یہ بھلائی اسی طرح برائی کو دھو دے گی جس طرح پانی گندگی کو دھو دیتا ہے۔ اس بھلائی کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً دل سے توبہ کرنا، نماز پڑھنا، ذکر و دعا میں مشغول ہونا، مالی صدقہ کرنا، ضرورت مندوں کے کام آنا، اس آدمی کے حق میں نیک دعائیں کرنا جس کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہو، وغیرہ۔

11-048

اختلاف کی حکمت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تیرا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ ہمیشہ اختلاف میں رہیں گے سوا ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے۔ اور اس نے اسی لئے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے اکٹھے بھر دوں گا۔ (ہود ۱۱۹_۱۱۸)

اس آیت میں جس اختلاف کا ذکر ہے، اس سے مراد مذہبی اختلاف ہے۔ یعنی دنیا میں مختلف مذاہب کا ہونا اور لوگوں کا الگ الگ مذہب اختیار کرنا۔ مجاہد اور قتادہ سے اس کی یہی تفسیر

منقول ہے۔ تفسیر القرطبی میں ہے: ای علی ادیان شتی، قاله مجاهد و قتادہ۔ (القرطبی الجزء التاسع، صفحہ ۱۱۴)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ صراط مستقیم یا دین حق صرف ایک ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ گمراہی ہے۔ (یونس ۳۲) ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ دنیا میں بہت سے دین کیوں۔ جب اللہ کے نزدیک ایک ہی دین ہے جو انسان کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ دنیا میں صرف ایک ہی دین ہوتا۔ دین حق کے سوا دوسرے ادیان یہاں سرے سے موجود ہی نہ ہوتے۔ تاکہ انسان غلط انتخاب کی گمراہی سے بچ جائے اور جنت کے راستہ پر چلنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔

جواب یہ ہے کہ یہ اللہ کی اسکیم ہی نہیں۔ اللہ نے اس دنیا میں امتحان کا وہ طریقہ رکھا ہے جس کو تعلیمی اصطلاح میں اکتشافی طریقہ (discovery method) کہا جاتا ہے۔ یعنی مختلف اور متفرق چیزوں کو سامنے بکھیر دینا اور طالب علم کو یہ موقع دینا کہ وہ اپنی سمجھ کو استعمال کر کے ان کی ایک وحدت بنائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسا کیا کہ ایک دین حق کے ساتھ دوسرے بہت سے غیر صحیح ادیان کو زندہ رہنے کا موقع دیا۔ اب ہر انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی خداداد عقل کو استعمال کر کے صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرے۔ وہ ادیان باطلہ کو پہچان کر انھیں رد کرے اور دین حق کی معرفت حاصل کر کے اسے اختیار کر لے۔

اسی مصلحت کی بنا پر اللہ نے انسان کو بے اختیار مخلوق نہیں بنایا جیسا کہ دوسری مخلوقات کا معاملہ ہے۔ مثلاً حیوانات اپنی جبلت کے تابع ہیں اور جمادات قانونِ فطرت کے تابع۔ بلکہ انسان کو مکمل اختیار دے کر زمین پر آباد کیا گیا۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ کسی جبر کے بغیر خود اپنی آزادی سے حق کا راستہ اختیار کرے۔ وہ خود اپنے فیصلہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑے اور خود اپنے فیصلہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کرے۔

خدا کی رحمت اس شخص کو ملتی ہے جو اپنے شعور کو اتنا جگائے کہ وہ امتحانی اختیار کے اندر

اپنی حقیقی بے اختیاری کو جان لے۔ وہ انسانی قدرت کے پردہ میں خدا کی قدرت کو دیکھ لے۔ یہ شعور ایسے آدمی سے سرکشی کی طاقت چھین لیتا ہے۔ حتی کہ اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ جب خدا اپنی رحمت کو اس کا حق کہہ کر پیش کرے تو اس کا شعور حقیقت پکار اٹھے ـــــ خدایا یہ بھی تیری رحمتوں کا ہی ایک کرشمہ ہے۔ ورنہ میرا عمل تو کسی قیمت کا مستحق نہیں۔

یہ اکتشافی طریقہ غیر معمولی حکمت پر مبنی ہے۔ اسی کی وجہ سے انسانوں کے اندر سرگرمیاں وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے ذریعہ فکری اور روحانی ترقی ہوتی ہے۔ اسی عمل کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ انسانی شخصیت ابتدائی حالت سے ترقی کر کے اعلیٰ انسانی درجہ تک پہنچ سکے۔ اگر ایسا نہ ہو تو انسان بھی اسی طرح یکساں ذہنی حالت پر ٹھہر کر رہ جائے گا جیسا کہ ہم حیوانات کی مثال میں دیکھتے ہیں۔

12-049

حقیقت کا اعتراف

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس کے مطابق، قدیم مصر کی ایک معزز خاتون نے حضرت یوسف کو بہکانا چاہا، جو اس وقت ایک نوجوان تھے۔ حضرت یوسف اس کے بہکاوے میں نہیں آئے اور اپنے لئے پاکبازی کے طریقہ کا انتخاب کیا۔ اس پر وہ عورت بگڑ گئی اور اس نے ان پر الزام لگا کر انھیں قید خانہ بھجوادیا۔ مگر بعد کو حقیقت کھلی اور یہ ثابت ہوا کہ حضرت یوسف بے قصور تھے۔

مذکورہ معزز خاتون اگرچہ مجبور نہ تھی تاہم اس کا ضمیر جاگ اٹھا اور اس نے صاف لفظوں میں کہا کہ: اب حق کھل گیا۔ میں نے ہی اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی اور بلاشبہ وہ سچا ہے۔ (یوسف ۵۱)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ مصری خاتون اگرچہ وقتی طور پر اپنے جذبات سے مغلوب ہو گئی تھی مگر اس کی فطرت زندہ تھی اور اس کے اندر انسانی صفات موجود تھیں۔ چنانچہ جب معاملہ واضح ہوا تو وہ پکار اٹھی کہ میں ہی غلطی پر تھی، اس معاملہ میں یوسف کی کوئی غلطی نہیں۔

یہ اعتراف سب سے بڑی انسانی صفت ہے۔ جس عورت یا مرد میں اعتراف کا مادہ ہو اس کو

کسی نہ کسی مرحلہ میں خدا کی مدد حاصل ہو گی اور وہ حق کو پا جائے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ اعتراف کی انسانی صفت کھو دیں، وہ گمراہی میں جیتے رہیں گے اور آخرکار اسی حال میں مر جائیں گے۔

12-050

غیر مسلم حکومت میں

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ بیان ہوا ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے کہ مصر کا مشرک بادشاہ ایک خاص مرحلہ میں ان کی شخصیت سے متاثر ہو گیا اور ان کو اپنے قریبی معززین میں شامل کرنا چاہا۔ اس وقت حضرت یوسف نے گفتگو کے دوران بادشاہ سے کہا کہ: مجھ کو ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو، میں نگہبان ہوں اور جاننے والا ہوں (یوسف ۵۵) بادشاہ نے اس کو منظور کر لیا۔ چنانچہ حضرت یوسف مصر کے اس مشرک بادشاہ کی حکومت میں ایک اعلیٰ وزیر کے منصب پر فائز ہو گئے۔

پیغمبر کے اس واقعہ سے یہ شرعی اصول اخذ ہوتا ہے کہ غیر مسلم حکومت کے تحت ایک مسلمان کے لئے ذمہ دارانہ عہدہ کو قبول کرنا اصولاً بالکل جائز ہے، حتیٰ کہ حسب حال وہ ایسا بھی کر سکتا ہے کہ خود اپنی طرف سے اس حکومتی عہدہ پر اپنے تقرر کی تجویز پیش کرے۔

12-051

نصرت کا اصول

حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے سوتیلے بھائیوں نے کم عمری میں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا۔ سوداگروں کے ایک قافلہ نے ان کو کنویں سے نکالا اور مصر کے بازار میں لے جا کر انھیں غلام کی حیثیت سے بیچ دیا۔ اس کے بعد آپ کے ساتھ مختلف قسم کے واقعات پیش آئے جن کا ذکر قرآن میں (اور بائبل میں) آیا ہے۔ مختلف مرحلوں سے گزرتے ہوئے آخرکار وہ وقت آیا جب کہ ان کو مصر میں وہ اعلیٰ حیثیت حاصل ہو گئی جس کا قرآن میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

اور ہم نے یوسف کو ملک میں بااختیار بنا دیا وہ اس میں جہاں چاہے جگہ بنائے۔ ہم جس پر چاہیں اپنی

عنایت متوجہ کریں۔(یوسف ۵۶)

آخری مرحلہ میں پورے قصہ کا خلاصہ حضرت یوسف کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ ایسے محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ (یوسف ۹۰) تقویٰ یہ ہے کہ آدمی زندگی کی جدو جہد کے دوران ہمیشہ حق پر قائم رہے، وہ کسی بھی حال میں حق سے انحراف نہ کرے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ زندگی کے مراحل میں صبر و تحمل سے کام لے۔ نتیجہ میں تاخیر کو دیکھ کر وہ بے صبر نہ ہو جائے۔ جو لوگ تقویٰ اور صبر کی ان دونوں صفتوں کے حامل ہوں وہ اللہ کے نزدیک محسنین، یعنی حسن عمل والے لوگ ہیں۔ ایسے لوگ بہر حال اللہ کی نصرت کے حق دار ٹھہریں گے اور آخر کار کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

13-052

عروج وزوال کے اسباب

قوموں کا عروج وزوال فطرت کے ایک اٹل قانون کی بنیاد پر ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر فرمایا ہے۔ یہ قانون اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: بے شک اللہ کسی گروہ کے مابقوم کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے ما بانفس کو نہ بدل ڈالے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر کوئی آفت لانا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور اللہ کے سوا اس کے مقابلہ میں کوئی ان کا مددگار نہیں (الرعد ۱۱)

اس آیت میں مابقوم سے مراد قومی حالت ہے اور ما بانفس سے مراد اس کی انفرادی حالت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی اجتماعی حالت اس قوم کے افراد کی حالت سے بندھی ہوئی ہے۔ افراد کے اندر جتنی صلاحیت ہوگی اتنا ہی صالح معاشرہ ان کے درمیان ظہور میں آئے گا۔ اسی بات کو ایک حدیث رسول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: تم لوگ جیسے ہو گے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے (کما تکونون، کذالك یؤمر علیکم) مشکاۃ المصابیح ۲/۱۰۹۷۔ گویا کہ فرد اور مجتمع (سماج) کے درمیان وہی نسبت ہے جو بیج اور فصل کے درمیان ہوتی

ہے۔ جیسا بیج ویسی ہی فصل، اسی طرح جیسے افراد ویسا ہی مجتمع۔

یہ قانون اتنا زیادہ اٹل ہے کہ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ جس معاشرہ کے افراد کے اندر بگاڑ آجائے، وہ معاشرہ لازماً تباہ ہو کر رہتا ہے۔ اس قانون کی زد میں آنے کے بعد کسی بھی گروہ کے لئے بچنا ممکن نہیں۔

اس قانون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی معاشرہ کو بہتر معاشرہ بنانا ہے تو اس عمل کا آغاز کہاں سے ہوگا۔ یہ آغاز کامیاب طور پر صرف افراد کی اصلاح سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معاشرہ کی سطح سے اصلاحی عمل کا آغاز کیا جائے تو خدا کی دنیا میں ایسے معکوس عمل کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔

13-053

نفع بخشی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر نالے اپنی اپنی مقدار کے موافق بہہ نکلے۔ پھر سیلاب نے ابھرتے جھاگ کو اٹھالیا اور اسی طرح کا جھاگ ان چیزوں میں بھی ابھر آتا ہے جن کو لوگ زیور یا اسباب بنانے کے لئے آگ میں پگھلاتے ہیں۔ اس طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ تو سوکھ کر جاتا رہتا ہے اور جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے۔ (الرعد ۱۷)

اس آیت میں مادی تمثیل کے ذریعہ فطرت کے قانون کو بتایا گیا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں قیام اور استحکام ان انسانوں کو ملتا ہے جو یہاں نفع بخشی کا ثبوت دیں۔ جو لوگ نفع بخشی کی صلاحیت کھو دیں، ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔

ایک فرد کو اپنے خاندان میں نفع بخش بننا ہے۔ اسی طرح اس کو اپنے سماج میں نفع بخش بننا ہے، اس نفع بخشی کے بغیر کسی کو نہ اپنے خاندان میں عزت کی جگہ ملے گی اور نہ اپنے سماج میں۔ یہی معاملہ قومی زندگی اور بین الاقوامی زندگی کا ہے یہاں بھی وہی لوگ عزت کا مقام پائیں گے جو

اپنے کو نفع بخش ثابت کر سکیں۔

ایک نفع بخشی وہ ہے جو مادی معنی میں ہو۔ دوسری نفع بخشی وہ ہے جو اخلاقی معنی میں ہو۔ لیکن اس سے بڑی نفع بخشی یہ ہے کہ کوئی فرد یا گروہ دنیا والوں کو سچائی کا تحفہ پیش کر سکے۔

13-054

اطمینان قلب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور جن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ سنو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (الرعد ۲۸)

اس آیت میں ایمان سے مراد معرفت ہے اور ذکر سے مراد خدا کی پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کرنا ہے۔ ذکر اللہ کی تشریح کے تحت تفسیر قرطبی میں ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یعنی وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اس کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔ پھر وہ اللہ کے کمالات کو اپنی بصیرت سے پہچان لیتے ہیں اور اس سے ان کے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (وقیل، بذکر اللہ) أی یذکرون اللہ ویتأملون آیاته فیعرفون کمال قدرته عن بصیرته) تفسیر القرطبی ۹/۳۱۵

دل کا اطمینان کیا ہے۔ دل کا اطمینان یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو پالے جس کو وہ پانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس دل کی بے اطمینانی یہ ہے کہ آدمی اس چیز کو پانے سے محروم رہے جس کو پانے کا شوق وہ اپنے دل میں لئے ہوئے تھا۔ اللہ کو چھوڑ کر کوئی آدمی دنیا کی جن چیزوں میں اطمینان ڈھونڈتا ہے وہ سب کی سب محدود اور ناقص ہیں۔ وہ انسان کی اصل طلب سے بہت زیادہ کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیوی یا مادی چیزوں کا پانا آدمی کو مطمئن نہیں کرتا۔ پانے سے پہلے آدمی ان چیزوں کے بارے میں بھرم میں رہتا ہے۔ مگر پانے کے بعد اس کا یہ بھرم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہو جاتا ہے گویا کہ پانا اور نہ پانا دونوں اس کے لئے برابر تھا۔

مگر اللہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب ایک آدمی اللہ کو دریافت کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے طلب کے پورے جواب کو پالیا ہے۔ جب آدمی اللہ کو یاد کرتا

ہے اور روحانی سطح پر اللہ سے اس کا تعلق قائم ہوتا ہے تو یہ اس کی پوری شخصیت کے لئے ایک مکمل یافت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ کائنات کی نشانیوں میں جب وہ غور کرتا ہے تو اس میں اس کو اپنے فکری تقاضوں کا جواب مل جاتا ہے۔ یہی وہ اعلیٰ تجربہ ہے جس کو اس آیت میں اطمینان قلب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

14-055

زیادتیوں پر صبر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوتِ توحید کے بعد جب مدعو قوموں کی طرف سے منفی رد عمل سامنے آیا تو پیغمبروں کا جواب یہ تھا: اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جب کہ اس نے ہم کو ہمارے راستے بتائے۔ اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صرف صبر کریں گے۔ اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے (ابراہیم ۱۲)

تمام پیغمبروں کو اپنی مخاطب قوموں سے ایذا رسانی کا تجربہ پیش آیا۔ تمام پیغمبروں کو ان کی قوم کے لوگ ہر طرح ستاتے رہے۔ مگر تمام پیغمبروں کا مشترک رویہ صرف ایک تھا، وہ ہے، ہر قسم کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے پر امن دعوت کا سلسلہ جاری رکھنا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے، کہ دعوت کا کام ایک انتہائی مثبت کام ہے۔ وہ صرف ایسے ماحول میں جاری رہ سکتا ہے جہاں داعی اور مدعو کے درمیان اعتدال کی فضا مسلسل موجود رہے۔ اسی معتدل فضا یا پر امن ماحول کو برقرار رکھنے کے لئے تمام پیغمبر یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ہی دعوت کی قیمت ہے، جہاں صبر نہیں وہاں دعوت بھی نہیں۔

بعد کے زمانہ میں جو لوگ دعوت کا کام کریں انھیں بھی صبر کی اس روش کو مکمل طور پر اختیار کرنا ہے۔ صبر کے بغیر دعوت کا کام نہ پچھلے زمانوں میں ہوا، اور نہ وہ آئندہ زمانوں میں ہو سکتا ہے۔ دعوت کی یہ ایک ایسی شرط ہے جو کبھی اور کسی کے لئے ساقط ہونے والی نہیں۔

14-056

درخت کی مثال

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمہؑ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے۔ اور جس کی شاخیں آسمان میں پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے اور اللہ لوگوں کے لئے مثال بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور کلمہؑ خبیثہ کی مثال ایک خراب درخت کی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ لیا جائے۔ اس کو کوئی ثبات نہ ہو۔ اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو بھٹکا دیتا ہے۔ اور اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (ابراہیم ۲۴۔۲۷)

موجودہ دنیا میں اللہ تعالٰی نے مختلف حقیقتوں کی ظاہری تمثیلات قائم کی ہیں۔ شجرہؑ طیبہ (اچھا درخت) ایک اعتبار سے مؤمن کی تمثیل ہے۔

درخت کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ وہ پوری کائنات کو اپنا غذائی دستر خوان بناتا ہے اور اس طرح بیج سے ترقی کرکے وہ ایک عظیم درخت کی صورت میں زمین کے اوپر کھڑا ہو جاتا ہے۔ درخت زمین سے پانی اور معدنیات اور نمکیات لے کر بڑھتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہوا اور سورج سے اپنے لئے غذا حاصل کرتا ہے۔ وہ نیچے سے بھی خوراک لیتا ہے اور اوپر سے بھی۔

یہی مومن کا معاملہ بھی ہے۔ عام درخت اگر ایک مادی درخت ہے تو مومن ایک شعوری درخت۔ مومن ایک طرف دنیا میں خدا کی تخلیقات اور اس کے نظام کو دیکھ کر عبرت اور نصیحت حاصل کرتا ہے۔ دوسری طرف "اوپر" سے اس کو مسلسل خدا کا فیضان پہنچتا رہتا ہے۔ وہ مخلوقات سے بھی اپنے لئے اضافہؑ ایمان کی خوراک حاصل کرتا ہے اور خالق سے بھی اس کا قربت اور تعلق کا معاملہ جاری رہتا ہے۔

درخت ہر موسم میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اسی طرح مومن ہر موقع پر وہ صحیح ردیہ یا جواب

(response) ظاہر کرتا ہے جو اسے ظاہر کرنا چاہئے۔ معاشی تنگی ہو یا معاشی فراخی، خوشی کا لمحہ ہو یا غم کا، شکایت کی بات ہو یا تعریف کی بات، زور آوری کی حالت ہو یا بے زوری کی حالت، ہر موقع پر اس کی زبان اور اس کا کردار وہی رد عمل ظاہر کرتا ہے جو خدا کے سچے بندے کی حیثیت سے اسے ظاہر کرنا چاہئے۔

دوسری مثال شجرۂ خبیثہ (جھاڑ جھنکاڑ) کی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کی مذکورہ اعلیٰ خوراک سے محروم ہے جس کے نتیجہ میں اس کے اوپر کانٹے اگتے ہیں۔ اس کی شاخوں میں کڑوے اور بدمزہ پھل لگتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی شخص جائے تو وہ بدبو سے اس کا استقبال کرتا ہے۔ ایسے درخت کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں اگے وہاں سے اس کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ غیر مومن کا ہے۔ وہ زمین میں ایک غیر مطلوب وجود کی حیثیت سے اگتا ہے۔ کائنات اپنی تمام بہترین نشانیوں کے باوجود اس کے لئے ایسی ہو جاتی ہے کہ جیسے اس کے لئے یہاں نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی نصیحت۔ خدا کا فیضان اگرچہ ہر وقت برستا ہے مگر اس کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس کے کردار اور معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہوتا۔

جو آدمی کلمۂ توحید کو اپنائے، اس کے لئے یہ کلمہ اس کی شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بن جاتا ہے جو خدا کا مطلوب انسان ہو۔ وہ دنیا میں خدا کی رحمتوں کو پائے اور آخرت میں جنت کا مستحق قرار دیا جائے۔

14-057

خدا کی نعمتیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اس نے تم کو ہر چیز میں سے دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو تو تم گن نہیں سکتے۔ بے شک انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔ (ابراہیم ۳۴)

انسان جب دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو اس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو کن کن

چیزوں کی ضرورت ہے۔ مگر بعد کو وہ حیرت انگیز طور پر پاتا ہے کہ یہاں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں پیشگی طور پر موجود ہیں۔ زمین میں موافق قوت کشش، سورج اور ہوا اور پانی، ہوا میں آکسیجن کا ذخیرہ، زمین پر ہر قسم کی غذائیں، سفر کے لئے سواریاں، وغیرہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ زمین میں طرح طرح کی معدنیات جو کار اور ہوائی جہاز سے لے کر ٹیلیفون اور کمپیوٹر تک، انگنت چیزوں میں ڈھل سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان کو اپنی راحت اور اپنی ضرورت کے لئے درکار تھی ان سب کو خدا نے پیشگی طور پر دنیا میں جمع کر دیا۔

یہ آیت قرآن کی صداقت پر ایک کھلی ہوئی دلیل ہے۔ نزول قرآن کے وقت اشیاء کائنات کے بارے میں انسان کی معلومات اتنی کم تھیں کہ انسان یقین کے ساتھ یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس دنیا میں خدا کی نعمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ نعمتوں کا انگنت ہونا اس وقت انسان کے لئے ایک نا معلوم بات تھی۔ یہ حقیقت پہلی بار صرف بیسویں صدی میں دریافت ہوئی۔ ایسی حالت میں دور سائنس سے پہلے کی ایک کتاب میں اس آیت کا ہونا ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک خدائی کتاب ہے نہ کہ ایک انسانی کتاب۔ کیوں کہ انسان اپنی محدود واقفیت کی بنیاد پر چودہ سو سال پہلے ایسا بیان نہیں دے سکتا تھا۔ یہ صرف خالق کائنات ہے جو ان باتوں کا علم رکھتا ہے اور ان کے بارے میں ایسا بیان دے سکتا ہے جو بعد کے زمانے کے انقلابات سے درست ثابت ہوں۔

15-058

حفاظت قرآن

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یقیناً ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (الحجر ۹)

قرآن ۶۱۰ء میں اترنا شروع ہوا۔ اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں اترا۔ یہ پریس کے دور سے بہت پہلے کا زمانہ ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت پیغمبر اور اہل ایمان کو مادی طاقتوں میں سے کوئی

طاقت حاصل نہ تھی۔ مزید یہ کہ مخالفتوں کی کثرت نے بظاہر سارے امکانات کو مسدود کر رکھا تھا۔ ایسی حالت میں قرآن کا یہ بیان کہ وہ مستقل طور پر باقی اور محفوظ رہے گا ایک نہایت غیر معمولی بیان تھا۔ ظاہری حالات کے اعتبار سے یہ ایک ناقابل قیاس واقعہ کی پیشین گوئی تھی۔ وہ تمام اسباب مستقبل کے اندھیروں میں چھپے ہوئے تھے جو حفاظت قرآن کو واقعہ بنانے کے لئے درکار تھے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ آیت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم کی کتاب ہے۔ چنانچہ عین پیشین گوئی کے مطابق بعد کے زمانے میں ایک کے بعد ایک وہ تمام واقعات ظاہر ہوئے جو قرآن کی حفاظت کی یقینی ضمانت بن گئے۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جدید پریس کا دور آگیا جس کے بعد کسی کے لئے قرآن کو مٹانا عملاً ناممکن ہو گیا۔ مزید یہ کہ انتہائی استثنائی طور پر عربی زبان جو کہ قرآن کی زبان ہے، اپنی اصل ابتدائی حالت میں موجود رہی جب کہ نزول قرآن کے زمانے کی کوئی بھی زبان آج اپنی قدیم حالت میں موجود نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی کتاب: عظمتِ قرآن)

15-059

منتخب بندے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے حکم کے باوجود، ابلیس نے آدم کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اللہ نے اس کو ہمیشہ کے لئے اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ اس وقت شیطان نے یہ جواب دیا: ابلیس نے کہا، اے میرے رب، جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اسی طرح میں زمین میں ان کے لئے مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کر دوں گا سوا ان کے جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، یہ ایک سیدھا راستہ ہے جو مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سوا ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔ اور ان سب کے لئے جہنم کا وعدہ ہے۔ (الحجر ۳۹۔۴۳)

اس آیت کے مطابق، ہر انسان شیطان کی زد میں ہے۔ شیطان ہر انسان کو بہکا کر تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس معاملہ میں شیطان کا طریقہ کیا ہے، وہ تزئین ہے۔ یعنی غلط کام کو اچھا بنا کر پیش کرنا، برائیوں کو بھلائی کی صورت میں دکھانا، بربادی کے راستے کی ایسی تشریح کرنا کہ وہ کامیابی کا راستہ دکھائی دینے لگے۔ یہی تزئین انسان کے مقابلہ میں شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

وہ کون لوگ ہیں جو شیطان کی اس تباہ کن تزئین سے بچ جائیں گے۔ یہ وہ منتخب انسان ہیں جو اپنے شعور کو اتنا زیادہ بیدار کر لیں کہ جب شیطان انھیں ایک غلط کام کو صحیح کام بنا کر دکھائے تو وہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ وہ شیطان کی تزئین کا پردہ پھاڑ کر اصل حقیقت کو دیکھ لیں۔ وہ اپنی خداداد عقل کے ذریعہ معاملات کو سمجھیں نہ کہ شیطان کی ترغیبات کے ذریعہ۔

16-060

دین میں اختلاف

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔ اور اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کر دیا۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں (النحل ۶۴-۶۵)۔ دوسرے مقام پر یہی بات اس طرح کہی گئی ہے: لوگ ایک امتؐ تھے۔ انہوں نے اختلاف کیا تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان کے ساتھ اتاری کتاب حق کے ساتھ تاکہ وہ فیصلہ کر دے ان باتوں کا جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ اور یہ اختلاف انہیں لوگوں نے کئے جن کو حق دیا گیا تھا، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، آپس کی ضد کی وجہ سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق سے حق کے معاملہ میں ایمان والوں کو راہ دکھائی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ (البقرہ ۲۱۳)

خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ جو دین بھیجا وہ ایک ہی دین ہے۔ پھر اتنے زیادہ پیغمبر کیوں آئے۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک پیغمبر خدا کا دین لاتا ہے تو اس کے ابتدائی ماننے والے اس کو پیغمبر کی تشریح کے مطابق مانتے ہیں۔ بعد کی نسلوں میں تعبیر و تشریح میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دین مختلف تشریحات کی صورت اختیار کر کے کئی دین بن جاتا ہے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے بنائے ہوئے دین کو صحیح اور دوسرے کو غلط کہنے لگتا ہے۔ اختلاف کے اس جنگل میں لوگوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا چیز ناحق۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کو بھیج کر یہ انتظام کیا تھا کہ لوگ مذہبی اختلاف کے جنگل کے درمیان خدا کے سچے راستے کو معلوم کر سکیں۔ یہی صورت حال آج بھی باقی ہے۔ ایک شخص خدا کے راستے کی تلاش میں ہو اور وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ کرے تو وہ یقیناً ذہنی انتشار میں پڑ جائے گا۔ کیوں کہ مذاہب کی جو تعلیمات آج موجود ہیں ان میں باہم سخت اختلافات ہیں۔ چنانچہ حق کے متلاشی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس چیز کو صحیح سمجھے اور کس چیز کو غلط۔

ایسی حالت میں پیغمبر آخر الزماں کا لایا ہوا دین خدا کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ کیوں کہ دوسرے ادیان کے برعکس، آپ کا دین ایک محفوظ دین ہے۔ وہ تاریخی اعتبار سے پوری طرح مستند ہے۔ اس بنا پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے جو دین چھوڑا وہی وہ حقیقی دین ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

تاہم تفسیر و تشریح میں اختلاف کا امکان بدستور باقی ہے۔ اس لئے پیغمبر آخر الزماں کے بعد بھی یہ صورت پیش آئے گی کہ اصل دین میں مختلف تعبیرات کر کے لوگ دوبارہ مختلف مذہبی دائروں میں بٹ جائیں۔ مگر آخری دین (اسلام) کا متن اب بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ اس لئے آدمی اگر انسانی تشریحات سے الگ ہو کر براہ راست متن کے ذریعہ خدا کے دین کو سمجھنا چاہے تو وہ حقیقی دین کو پانے سے محروم نہیں رہ سکتا، بشرطیکہ وہ اس معاملہ میں پوری طرح سنجیدہ ہو۔

یہاں اس معاملے کو بارش کی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ بارش زمین کے ہر حصہ پر برستی ہے۔ مگر جو زرخیز زمین ہے اسی کو بارش سے فائدہ ہوتا ہے۔ بنجر زمین بارش کے باوجود بارش کے فائدے سے محروم رہتی ہے۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ جس آدمی نے اپنی استعداد کو زندہ رکھا ہو وہ اختلاف کے باوجود اصل دین کو پالے گا۔ اور جس آدمی کی استعداد مردہ ہو جائے وہ اختلافات میں الجھ کر رہ جائے گا۔ وہ اصل دین کو پانے میں ناکام رہے گا۔

16-061

وحی کی شہادت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی کہ پہاڑوں اور درختوں اور جہاں ٹٹیاں باندھتے ہیں ان میں گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چل۔ اس کے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے، اس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔ بے شک اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ (النحل ۶۸۔۶۹)

قرآن کی اس آیت میں شہد کی مکھی کے معاملہ کو بتانے کے لئے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر انسان شہد کی مکھی کے معاملے پر غور کرے تو وہ پیغمبر پر آنے والی وحی کو بھی سمجھ سکتا ہے۔

شہد کی مکھی کی زندگی میں ایسی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو اس حقیقت کو بتاتی ہیں کہ شہد کی مکھی کو یقینی طور پر خارج سے وحی جیسی رہنمائی دی جارہی ہے، خارجی رہنمائی کے بغیر شہد کی مکھی خود سے ایسا نہیں کر سکتی۔ شہد کی مکھی جس طرح کام کرتی ہے اس میں اس نوعیت کی کثیر مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا چھتہ۔ شہد کی مکھی اپنا ہر چھتہ انتہائی صحت کے ساتھ اعلیٰ ریاضیاتی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے بناتی ہے۔ اس کو یہ ریاضیاتی علم کس نے دیا۔ شہد کے ایک چھتے میں ہزاروں مکھیاں کام کرتی ہیں۔ ان کا یہ کام اتنے زیادہ منظم انداز میں ہوتا ہے جس کی مثال کسی بھی

انسانی کارخانے میں موجود نہیں۔ شہد کی مکھیوں کو یہ ڈسپلن کس نے سکھایا۔ یہ مکھیاں جب پھولوں کا رس لاکر اپنے چھتے میں جمع کرتی ہیں تو اسی کے ساتھ وہ انتہائی مناسب مقدار میں اس کے اندر ایک ایسا تحفظی مادہ (preservative) شامل کرتی ہیں جو شہد کو لمبی مدت تک خراب ہونے سے بچانے والا ہے۔ یہ فن شہد کی مکھی کو کس نے سکھایا۔ شہد کی مکھی شہد لانے کے لئے اکثر اپنے چھتے سے کئی کلو میٹر دور تک جاتی ہے۔ صبح کو جب وہ شہد لانے کے لئے اپنے چھتے سے روانہ ہوتی ہے تو وہ کسی قدر اندھیرے میں روانہ ہوتی ہے۔ لیکن شام کو جب وہ شہد لے کر آپنی آخری ٹرپ سے لوٹتی ہے تو وہ کسی قدر اجالے میں لوٹتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبح کو اس کا سفر اندھیرے سے اجالے کی طرف ہوتا ہے لیکن شام کو اجالے سے اندھیرے کی طرف۔ اس لئے صبح کو اگر وہ اندھیرے میں روانہ ہو تو اطمینان ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر میں اجالا ہو جائے گا۔ اور راستے صاف دکھائی دینے لگیں گے۔ اس کے برعکس اگر وہ شام کو دیر سے واپس ہو تو اندیشہ ہے کہ جلد ہی اندھیرا ہو جائے اور وہ اپنے راستہ سے بھٹک جائے۔ صبح کی پہلی ٹرپ اور شام کی آخری ٹرپ میں فرق کرنے کا یہ شعور اس کو کس نے دیا۔

شہد کی مکھی کی کارکردگی میں اس طرح کی بہت سی انوکھی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مثالیں ناقابل تردید طور پر ثابت کرتی ہیں کہ شہد کی مکھی کو خارجی وحی سے رہنمائی مل رہی ہے۔ اس طرح شہد کی مکھی کی وحی ثابت ہونے کے بعد پیغمبر کی وحی بھی یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ ایک کے ساتھ وحی کا امکان ثابت ہونے کے بعد دوسرے کے ساتھ وحی کا امکان اپنے آپ ثابت ہو جاتا ہے۔ دونوں میں ایک منطقی لزوم ہے جس سے انکار کسی بھی طرح ممکن نہیں۔

16-062

دین فطرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا۔ اور اللہ روکتا ہے فحشاء سے اور منکر سے اور سرکشی سے۔ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ

تم یاد دہانی حاصل کرو۔ (النحل ۹۰)

دنیا میں کوئی اللہ کا بندہ کس طرح رہے، اس کا واضح بیان اس آیت میں موجود ہے۔ اس کے مطابق، پہلی چیز جس کا ایک شخص کو اہتمام کرنا ہے وہ عدل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کا جو حق دوسرے پر آتا ہے وہ اس کو پوری طرح ادا کرے، خواہ صاحب حق کمزور ہو یا طاقت ور، اور خواہ وہ پسندیدہ شخص ہو یا ناپسندیدہ۔ حقوق کی ادائیگی میں صرف حق کا لحاظ کیا جائے نہ کہ دوسرے اعتبارات کا۔

دوسری چیز احسان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حقوق کی ادائیگی میں عالی ظرفی کا طریقہ اپنایا جائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کیا جائے۔ قانونی دائرہ سے آگے بڑھ کر لوگوں کے ساتھ فیاضی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے۔ آدمی کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ حتی الامکان وہ اپنے لئے اپنے حق سے کم پر راضی ہو جائے، اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینے کی کوشش کرے۔

تیسری چیز ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس طرح اپنے بیوی بچوں کی ضرورت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس کو پورا کرتا ہے، اسی طرح وہ دوسرے قریبی لوگوں کی ضرورت کے بارے میں بھی حساس ہو۔ ہر صاحب استعداد شخص اپنے مال پر صرف اپنا اور اپنے گھر والوں ہی کا حق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کو بھی وہ اپنی ذمہ داری میں شامل کرے۔

اس کے بعد آیت میں تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔

پہلی چیز فحشاء ہے۔ اس سے مراد کھلی ہوئی اخلاقی برائیاں ہیں۔ یعنی وہ برائیاں جن کا برا ہونا خود اپنے ضمیر کے تحت ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے۔ اور لوگ عام طور پر اس کو شرمناک سمجھتے ہیں۔

دوسری چیز منکر ہے۔ منکر معروف کا الٹا ہے۔ معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کو ہر معاشرے میں اچھا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس منکر سے مراد وہ نامعقول کام ہیں جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہیں۔ اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کو انسان عام طور پر برا جانتے

ہیں اور جن کو قبول کرنے سے انسان کی فطرت انکار کرتی ہے۔

تیسری چیز بغی ہے۔ اس کے معنی ہیں حد سے تجاوز کرنا۔ اس میں ہر وہ سرکشی داخل ہے جب کہ آدمی اپنی واقعی حد سے گزر کر دوسرے شخص پر دست درازی کرے۔ وہ کسی کی جان یا مال یا آبرو لینے کے لئے اس کے اوپر ناحق کارروائیاں کرے۔ وہ اپنے زور واثر کو ناجائز فائدہ اٹھانے کے لئے استعمال کرنے لگے۔

اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ خود فطرت انسانی کی آواز ہیں۔ آدمی اگر غور کرے تو وہ پائے گا کہ قرآن کی یہ تعلیم عین وہی ہے جس کی طلب پیشگی طور پر انسان کے اندر موجود تھی۔ قرآن کی اس بات کی حیثیت آدمی کو اس کی اپنی فطرت کی یاددلاتا ہے نہ کہ کسی خارجی حکم کو صرف اوپر سے نافذ کرنا۔ یہ احساس آدمی کو مجبور کرے گا کہ وہ قرآن کے پیغام کو خود اپنی فطرت کی آواز سمجھ کر قبول کرلے۔

16-063

یکساں معاملہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص کوئی نیک کام کرے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو زندگی دیں گے، ایک اچھی زندگی۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا ہم ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔ (النحل ۹۷)

اسلام کے مطابق، عورت اور مرد کے درمیان میدانِ کار (workplace) کے اعتبار سے تو ضرور فرق ہے۔ مگر خدا کی نعمتوں میں حصہ دار بننے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کوئی بھی فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ معرفت خداوندی حاصل کرے اور اس کے مطابق وہ صالح کردار کا ثبوت دے تو دونوں یکساں طور پر اس خدائی رحمت کے مستحق قرار پائیں گے جو اس دنیا میں انسان کے لئے مقدر کی گئی ہے۔

اس خدائی رحمت کا پہلا حصہ یہ ہے کہ اس کو دنیا میں وہ زندگی حاصل ہو جو خدا کے نزدیک پاک زندگی (حیوۃ طیبہ) ہے۔ یعنی ہر موقع پر یہ توفیق ملنا کہ اس کے ذہن میں صحیح اور مثبت سوچ جگہ پائے۔ اسی طرح اس کو توفیق ملے کہ وہ ہر موقع پر وہ روش اختیار کرے جو اس دنیا میں ہر انسان کے لئے صحیح اور درست روش ہے۔ اس خدائی رحمت کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ یعنی اس کے ایمان اور اس کے عمل کو قبول کر کے ابدی جنت میں اس کا داخلہ۔

آیت کے مطابق، خدا کی یہ رحمت جس طرح ایک مرد کے لئے ہے، ٹھیک اسی طرح وہ ایک عورت کے لئے بھی ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ مرد کو اپنے دائرہ کار میں ایمان و عمل کا ثبوت دینا ہے اور عورت کو اپنے دائرہ کار میں۔

16-064

دعوت کا اسلوب

قرآن میں دعوت کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں۔ (النحل ۱۲۵)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ دعوت حق کا اسلوب کیا ہونا چاہئے۔ اس کو بتانے کے لئے قرآن میں تین لفظ استعمال کئے گئے ہیں ـــــ حکمت، موعظت حسنہ اور جدال احسن۔

حکمت سے مراد دلیل و برہان ہے۔ کوئی دعوتی عمل اسی وقت حقیقی دعوتی عمل ہے جب کہ وہ ایسے دلائل کے ساتھ ہو جس میں مخاطب کے ذہن کی پوری رعایت شامل ہو۔ مخاطب کے نزدیک، کسی چیز کے ثابت شدہ ہونے کی جو شرائط ہیں، ان شرائط کی تکمیل کے ساتھ جو کلام کیا جائے اسی کو یہاں حکمت کا کلام کہا گیا ہے۔ جس کلام میں مخاطب کی ذہنی و فکری رعایت شامل نہ ہو وہ غیر حکیمانہ کلام ہے۔ اور ایسا کلام کسی کو داعی کا مرتبہ نہیں دے سکتا۔

موعظت حسنہ اس خصوصیت کا نام ہے جو دردمندی اور خیر خواہی کی نفسیات سے کسی کے کلام میں پیدا ہوتی ہے۔ جس داعی کا حال یہ ہو کہ خدا کی عظمت و جلال کے احساس سے اس کی شخصیت کے اندر بھونچال آگیا ہو، جب وہ خدا کے بارے میں بولے گا تو یقینی طور پر اس کے کلام میں عظمت خداوندی کی بجلیاں چمک اٹھیں گی۔ جو داعی جنت اور جہنم کو دیکھ کر دوسروں کو اسے دکھانے کے لئے اٹھے اس کے کلام میں یقینی طور پر جنت کی بہاریں اور جہنم کی ہولناکیاں گونجتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ان چیزوں کی آمیزش داعی کے کلام کو ایسا بنادے گی جو دلوں کو پگھلادے اور آنکھوں کو اشک بار کردے۔

دعوتی کلام کی اصل خصوصیات یہی دو ہیں ــــــ حکمت اور موعظت حسنہ۔ تاہم ہمیشہ دنیا میں کچھ ایسے لوگ موجود رہتے ہیں جو غیر ضروری بحثیں کرتے ہیں۔ جن کا مقصد الجھانا ہوتا ہے نہ کہ سمجھنا اور سمجھانا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ایک سچا داعی جو انداز اختیار کرتا ہے، اسی کا نام جدال احسن ہے۔ وہ ٹیڑھی بات کا جواب سیدھی بات سے دیتا ہے۔ وہ سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالتا ہے۔ وہ الزام تراشی کے مقابلہ میں صبر کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔

داعیٔ حق کی نظر سامنے کے انسان کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اس خدا کی طرف ہوتی ہے جو سب کے اوپر ہے۔ اس لئے وہ وہی بات کہتا ہے جو خدا کی میزان میں حقیقی بات ٹھہرے اور جس کے لئے اسے خدا کے یہاں شرمندہ ہونا نہ پڑے۔

16-065

داعیانہ کردار

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے (النحل ۱۲۶)

اس آیت میں داعی کا وہ کردار بتایا گیا ہے جو مخالفین کے مقابلہ میں اس کو اختیار کرنا ہے۔ فرمایا کہ اگر مخالفین کی طرف سے ایسی تکلیف پہنچے جس کو تم برداشت نہ کر سکو تو تم کو اتنا ہی کرنے

کی اجازت ہے جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اجازت صرف انسان کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے بطور رعایت ہے۔ ورنہ داعی کا اصل کردار تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر تکلیف پر صبر کرے۔ وہ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانہ میں ڈال دے۔

مخاطب اگر حق کو نہ مانے۔ وہ اس کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو اس وقت داعی کو سب سے بڑی تدبیر جو کرنی ہے وہ صبر ہے۔ یعنی رد عمل کی نفسیات یا جوابی کارروائیوں سے بچتے ہوئے مثبت طور پر حق کا پیغام پہنچاتے رہنا۔

17-066

خدائی نشانیوں کا تجربہ

قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کے سفر معراج کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے (بنی اسرائیل ۱)

قرآن کی اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ غالباً ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں تھے۔ رات کے وقت پر اسرار طور پر خدا کے فرشتہ نے آپ کو مکہ سے یروشلم پہنچایا۔ اس سفر کی ابتدائی منزل مسجد اقصیٰ (دور کی مسجد) تھی۔ یہ دراصل وہ جگہ (site) ہے جہاں پہلے ہیکل سلیمان واقع تھا۔ اس ہیکل (عبادت گاہ) کو حضرت سلیمان نے ۱۰۰۴ق م میں بنوایا تھا۔ اس کے بعد بابل کے بادشاہ بخت نصر نے ۵۸۶ق م میں اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد اسرائیلی پیغمبر عذراہ اور نحمیاہ نے اس کو تقریباً ۵۱۵ق م میں دوبارہ تعمیر کیا۔ اس کے بعد تیٹس رومی اپنی فوجوں کے ساتھ ۷۰ء میں یروشلم آیا اور اس نے پورے ہیکل کو توڑ کر اس کو کھنڈر بنا دیا۔

جب پیغمبر اسلام کا سفر معراج ہوا تو یہ مقام غالباً اسی طرح کھنڈر کی حالت میں تھا۔ کیوں کہ یہودیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ہیکل (عبادت گاہ) کی تعمیر صرف خدا کا پیغمبر ہی کر سکتا ہے۔ اس حادثہ کے بعد چونکہ ایسا کوئی پیغمبر ان کے یہاں نہیں آیا جو اس کی از سر نو تعمیر کرے۔ اس لئے وہ جگہ اسی ویران حالت میں پڑی رہی۔ روایات کے مطابق، پیغمبر اسلام کے اس سفر کے موقع پر تمام پچھلے پیغمبر اکٹھا ہوئے۔ انہوں نے اس جگہ نماز باجماعت ادا کی اور پیغمبر اسلام نے اس کی امامت فرمائی۔

یہ سفر جس کو قرآن میں اسراء کہا گیا ہے، اس کے بارے میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس میں لنریہ من آیاتنا (تاکہ ہم اس کو اپنی بعض نشانیاں دکھائیں) کا مطلب کیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو مسجد اقصیٰ یا یروشلم کے آس پاس موجود ہیں۔ یعنی سابق پیغمبروں کے آثار اور زمینی شادابی وغیرہ۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کو اس غیر معمولی سفر سے متعلق مانا جائے۔ جیسا کہ خود آیت میں ارشاد ہوا ہے (**سبحان الذی اسری بعبدہ لیلاً من المسجدالحرام إلی المسجد الأقصی**)۔

اسراء کے اس واقعہ کا سب سے زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ایک بے حد تیز رفتار سفر کی صورت میں ہوا۔ اس "نشانی" کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اس جدید امکان کا پیشگی تعارف کرایا جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت میں ظاہر ہونے والا تھا۔ یعنی وہی چیز جس کو آج جدید مواصلات (Modern Communication) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فطرت کی جو نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں آئی ہیں انہوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ انسان انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرے، وہ اپنے پیغامات کو ایک لمحہ کے اندر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سارے اہل عالم کے لئے نذیر و بشیر بنا کر بھیجے گئے تھے (الفرقان ۱) آپ کی بعثت کی اس عالمی نوعیت کا تقاضہ تھا کہ آپ کے پیرووں کو وہ اسباب دیئے جائیں جن کے

ذریعہ وہ نسل در نسل آپ کے دین کی عالمی اشاعت کر سکیں۔ مذکورہ ذمہ داری کی ادائیگی اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام کے بعد ایسے حالات پیدا کئے جن کے نتیجہ میں مواصلات کا نیا دور دنیا میں آگیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں اونٹ پر سفر ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک شخص کو مکہ سے یروشلم تک پہنچنے کے لئے ایک مہینہ سے زیادہ لمبی مدت درکار ہوتی تھی۔ مگر اب جدید انقلاب نے اس معاملہ کو یکسر بدل دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کا یہ تیز رفتار سفر گویا کمیونیکیشن کے نئے دور کا افتتاح تھا جو خود آپ کے دین کے لئے پیشگی بشارت کے طور پر کرا لیا گیا۔

17-067

خوش حال طبقہ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر بات ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہم اس بستی کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ (بنی اسرائیل ۱۶)

یہ قرآن کے مخصوص اسلوب میں فطرت کے ایک قانون کا بیان ہے۔ وہ یہ کہ کسی قوم کے بننے اور بگڑنے کا انحصار اس کے طبقۂ خواص پر ہوتا ہے، نہ کہ طبقۂ عوام پر۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر ہمیشہ اپنے دعوتی اور اصلاحی عمل کا نشانہ خواص کو بناتے ہیں۔ عوام کو اپنے دعوتی عمل کا اصل نشانہ بنانا پیغمبرانہ سنت کے مطابق نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی قوم کی اصلاح یا کسی قوم کے بگاڑ کا معیار اس قوم کا خوش حال اور سربرآوردہ طبقہ ہوتا ہے۔ یہی طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہی طبقہ اپنے وسائل کے ذریعہ لوگوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی طبقہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ کسی گروہ کے اوپر قائد بننے کی قیمت ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی قوم کے سربرآوردہ طبقہ کی اصلاح پوری قوم کی اصلاح ہے اور کسی

قوم کے سربرآوردہ طبقہ کا بگاڑ پوری قوم کا بگاڑ۔

17-068

دنیا مقصودِ اصلی نہیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو شخص عاجلہ کو چاہتا ہو، اس کو ہم اس میں سے دے دیتے ہیں، جتنا ہم جس کو دینا چاہیں۔ پھر ہم نے اس کے لئے جہنم ٹھہرا دی ہے، وہ اس میں داخل ہوگا بد حال اور راندہ ہو کر۔ اور جس نے آخرت کو چاہا اور اس کے لئے دوڑ کی جو کہ اس کی دوڑ ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش مقبول ہوگی۔ ہم ہر ایک کو تیرے رب کی بخشش میں سے پہنچاتے ہیں، ان کو بھی اور ان کو بھی۔ اور تیرے رب کی بخشش کسی کے اوپر بند نہیں۔ (بنی اسرائیل ۱۸۔۲۰)

دنیا میں زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے، دنیا کے ذریعہ دنیا کو حاصل کرنا۔ دوسرا ہے، دنیا کے ذریعہ آخرت کو حاصل کرنا۔ یہ دونوں ہی مواقع ہر آدمی کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا کام ہے کہ وہ دونوں میں سے کس کو لیتا ہے اور کس کو چھوڑ دیتا ہے۔ آدمی کو ایک ایسا وجود دیا گیا ہے جو نہایت اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ دوسری طرف خارجی دنیا میں ہر قسم کے اسباب وافر مقدار میں موجود ہیں۔ کوئی آدمی دونوں میں سے جس مقصد کو اپنا نشانہ بنائے، تمام اسباب فوراً اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ اسباب خود سے کبھی ایسا نہیں کہتے کہ ہم کو فلاں مقصد کے لئے استعمال کرو اور فلاں مقصد کے لئے استعمال نہ کرو۔

یہ صورت حال آدمی کو اکثر غلط فہمی میں ڈال دیتی ہے۔ حالات کی مساعدت کو دیکھ کر وہ سمجھ لیتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ ٹھیک کر رہا ہوں۔ مگر یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ آدمی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ صرف اس لئے اپنے آپ کو درست سمجھ لے کہ وہ بظاہر ترقی اور کامیابی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بجائے ہر آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ اصول حق کو

معیار بنائے اور اس کی روشنی میں اپنے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرے۔

17-069

سمع، بصر، فؤاد

قرآن میں مختلف احکام دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کی تم کو خبر نہیں۔ بے شک کان اور آنکھ اور دل سب کی آدمی سے پوچھ ہو گی۔ (بنی اسرائیل ۳۶)

انسان کو تین نہایت خاص صلاحیتیں دی گئی ہیں ــــــ سمع اور بصر اور فؤاد یعنی سننا اور دیکھنا اور سوچنا۔ یہ تینوں صلاحیتیں ایک اعتبار سے نعمت ہیں اور دوسرے اعتبار سے وہ امتحان کا پرچہ ہیں۔ موجودہ دنیا میں چیزیں اس طرح ملی جلی حالت میں ہیں کہ صحیح رائے قائم کرنا ہمیشہ بے حد نازک کام ہوتا ہے۔ آدمی کسی کے بارہ میں کوئی ایک بات سنتا ہے۔ حالاں کہ اس کے سوا بھی اس کی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ آدمی کسی معاملہ کے ایک جزء کو دیکھتا ہے، جب کہ اس کے بہت سے اجزاء اس کے سامنے نہیں ہوتے۔ اسی طرح آدمی کے دماغ میں ایک بات آتی ہے، مگر وہ صرف ادھوری بات ہوتی ہے نہ کہ پوری بات۔

ایسی حالت میں آدمی کے اوپر لازم ہے کہ جب بھی وہ کسی کے بارے میں کوئی رائے بنائے تو پوری تحقیق کے بعد بنائے۔ اس کو چاہئے کہ وہ پوری بات سنے۔ وہ معاملے کے ہر پہلو کو دیکھے۔ وہ کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اس کے بارے میں تحقیق کا حق ادا کرے۔ ان شرطوں کی تکمیل کے بغیر جو آدمی محض جزئی یا سرسری علم کی بنا پر ایک رائے قائم کر لے، اس کے لئے اندیشہ ہے کہ وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائے اور اس کو اپنے کان اور آنکھ اور اپنے ذہن کے غلط استعمال کی سخت سزا بھگتنی پڑے۔

17-070

دنیا اور آخرت

انسان کو دی جانے والی خصوصی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور

جو شخص اس دنیا میں اندھا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا اور وہ بہت دور پڑا ہوگا راستے سے۔ (بنی اسرائیل ۷۲)

موجودہ دنیا میں خدائی حقیقتوں کو غیب کی حالت میں رکھا گیا ہے۔ آخرت میں یہ تمام خدائی حقیقتیں کھلے طور پر سامنے آجائیں گی۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں دے کر دنیا میں بسایا ہے۔ اب انسان کا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرے اور غیبی حقیقتوں کو دریافت کرکے انھیں اپنی زندگی کا سرمایہ بنائے۔ یہی آدمی کی کامیابی ہے۔ جو آدمی آنکھیں رکھتے ہوئے دنیا میں خدا کے جلوؤں کو نہ دیکھ سکے، وہ گویا اندھا ہے۔ ایسے لوگ جس طرح دنیا میں اندھے رہے، اسی طرح وہ آخرت میں بھی اندھے رہیں گے۔ وہ آخرت کی نعمتوں میں اپنا حصہ پانے سے ابدی طور پر محروم رہ جائیں گے۔

17-071

ذہنی سانچہ

انسان کی حالت بتاتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کہو کہ ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۴)

شاکلہ سے مراد ذہنی سانچہ ہے۔ ہر آدمی کے حالات اور رجحانات کے تحت دھیرے دھیرے اس کا ایک خاص ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو نفسیات میں کنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر صحیح فطری ذہن لے کر پیدا ہوتا ہے اس کے بعد ہر آدمی دھیرے دھیرے کنڈیشننگ تھنکنگ کا کیس بن جاتا ہے۔ وہ اسی کے زیر اثر سوچتا ہے اور اسی کے مطابق اس کا نقطۂ نظر بنتا ہے۔ مگر صحیح نقطۂ نظر وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہو اور غلط وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق غلط ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہے۔ آدمی کو یہ کرنا ہے کہ اس کے شاکلہ نے اس کا جو ذہنی سانچہ بنادیا ہے۔ وہ اس سانچہ کو توڑے۔ تاکہ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھ سکے جیسی کہ وہ ہیں۔

بالفاظِ دیگر وہ چیزوں کو ربانی نگاہ سے دیکھنے لگے ـــــ جو لوگ اپنے ذہنی خول میں گم ہوں، وہ بھٹکتے ہوئے لوگ ہیں۔ اور جو لوگ اپنے ذہنی خول سے نکل کر خدائی نقطۂ نظر کو پالیں وہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت پائی۔

17-072

علم قلیل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ (بنی اسرائیل ۸۵)

اس آیت میں روح سے مراد وحی الٰہی ہے۔ جو لوگ وحی کی حقیقت جاننے کے لئے سوالات کر رہے تھے، ان کو براہِ راست طور پر سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ کہا گیا کہ انسان کو صرف علم قلیل (محدود علم) دیا گیا ہے، اس کو علم کثیر (لامحدود علم) نہیں دیا گیا۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ اپنی محدودیت کا اعتراف کرتے ہوئے اجمالی علم پر قناعت کی جائے۔

یہ تصور علم کی کلید ہے۔ موجودہ دنیا میں معرفت یا گہری حقیقت تک وہی انسان پہنچے گا جو اس حقیقت کا اعتراف کرے اور غور و فکر کے عمل کو ممکن دائرہ کے اندر جاری کرے اور اس دائرہ کو توڑ کر ناممکن دائرہ میں داخل نہ ہو جائے۔

17-073

دنیا کی زینت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: جو کچھ زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو جانچیں کہ ان میں کون اچھا عمل کرنے والا ہے اور ہم زمین کی تمام چیزوں کو ایک صاف میدان بنا دیں گے۔ (الکہف ۷۔۸)

زمین کی سطح پر ہر سال یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ یہاں بارش ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہاں مختلف قسم کا سبزہ اور پھول اگتا ہے۔ زمین نہایت خوش نما دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کے بعد موسم

بدلتا ہے گرم ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ اس کے بعد سارا منظر بدل جاتا ہے۔ جہاں خوش نما سبزہ تھا وہاں خشک مٹی نظر آنے لگتی ہے۔

تمثیل کے روپ میں یہی دنیا کی حقیقت ہے۔ دنیا کی چیزیں انسان کو بظاہر نہایت خوش نما دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ان کی رنگینیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ رنگینیاں ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ یہ رنگینیاں حقیقی نہیں ہیں بلکہ صرف آزمائش کے لئے ہیں۔ کامیاب انسان وہ ہے جو بہار اور خزاں کی تمثیل میں دنیا اور آخرت کا نقشہ دیکھ لے۔ وہ دنیا کی وقتی رنگینیوں میں گم ہونے کے بجائے آخرت کی حقیقی دنیا کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے۔

18-074

مال و اولاد

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ان کو دنیا کی زندگی کی مثال سناؤ۔ جیسے کہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا۔ پھر اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہو گئیں پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں جس کو ہوائیں اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ مال اور اولاد دنیوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں۔ (الکہف ۴۵۔۴۶)

موجودہ دنیا بعد کو آنے والی آخرت کی تمثیل ہے۔ پانی پاکر زمین جب سرسبز ہو جاتی ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح رہے گی، مگر اس کے بعد موسم بدلتا ہے اور سارا سبزہ سوکھ کر ختم ہو جاتا ہے۔

یہی حال دنیا کی رونقوں کا ہے۔ مال و دولت میں انسان کے لئے بڑی کشش ہے۔ اسی طرح اپنی اولاد سے اس کو غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ مگر یہ تمام رونقیں انتہائی عارضی ہیں۔ قیامت بہت جلد ان کو اس طرح ختم کر دے گی کہ ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دنیا کی رونقیں ہمیشہ باقی نہیں رہتیں مگر یہاں ایک اور چیز ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔

اور وہ انسان کے نیک اعمال ہیں۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالنے سے باغ اگتا ہے اسی طرح اللہ کی یاد اور اللہ کی فرماں برداری سے بھی ایک باغ اگتا ہے۔ اس باغ پر کبھی خزاں نہیں آتی۔ مگر دنیوی باغ کے برعکس یہ دوسرا باغ آخرت میں اگتا ہے اور وہیں وہ اپنے اگانے والے کو ملے گا۔

19-075

پیغمبروں کی امت

قرآن میں مختلف پیغمبروں اور ان پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے۔ پھر اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے پیغمبروں میں سے اپنا فضل فرمایا۔ آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا تھا۔ اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور ان کو مقبول بنایا۔ جب ان کو خدائے رحمان کی آیتیں سنائی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو کھو دیا اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے، پس عنقریب وہ اپنی خرابی کو دیکھیں گے، البتہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیا تو یہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ (مریم ۵۸۔۶۰)

پیغمبر پر ایمان لانے والوں کی پہلی نسل زندہ ایمان کی حامل ہوتی ہے۔ اس پہلی نسل کے افراد کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ خدا کے کلام کو سن کر تڑپ اٹھتے ہیں۔ خدا کا کلام ان کے شعور کو آخری حد تک جگا دیتا ہے۔ خدا سے ان کا تعلق اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اس کی یاد میں روتے ہیں۔ ان کا سجدہ ان کے لئے خدا سے قربت کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ یہی لوگ حقیقتوں میں خدا کا انعام پانے والے لوگ ہیں۔

اس کے بعد ان کی بعد کی نسلوں کا حال بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اب ان کا ایمان زندہ ایمان نہیں ہوتا بلکہ صرف رسمی ایمان ہوتا ہے۔ ان کی عبادتوں میں روح (اسپرٹ) باقی نہیں رہتی۔ اب ان کا رہنما صرف ان کی خواہشیں ہوتی ہیں جس کے پیچھے وہ اپنی پوری زندگی ڈال دیتے

ہیں۔ خدا کے نزدیک ان کا انجام گمراہوں جیسا ہے خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو ہدایت یاب سمجھتے ہوں۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جو خدا کی طرف لوٹیں اور زندہ ایمان کا ثبوت دے کر دوبارہ پہلی نسل کی مانند ہو جائیں۔

20-076

دعوت پر نصرت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب اللہ نے حضرت موسیٰ کو پیغمبری دی تو اس کے بعد انھوں نے کہا کہ ـــــ اے میرے رب، میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے۔ اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔ تاکہ لوگ میری بات سمجھیں۔ اور میرے خاندان سے میرے لئے ایک مددگار بنا دے، ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میری کمر کو مضبوط کر دے۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں۔ اور کثرت سے تیرا چرچا کریں۔ بے شک تو ہم کو دیکھ رہا ہے۔ فرمایا کہ دے دیا گیا تم کو اے موسیٰ تمہارا سوال۔ (طٰہٰ ۲۵-۳۶)

داعی کے لئے سینہ کا کھلنا یہ ہے کہ حسب موقع اس کے اندر موثر مضامین کا ورود ہو۔ معاملہ کا آسان ہونا یہ ہے کہ مخالفین کبھی دعوت کی راہ بند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ زبان کی گرہ کھلنا یہ ہے کہ بڑے سے بڑے مجمع میں بلا جھجک دعوت پیش کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے ـــــ حضرت موسیٰ نے جب یہ درخواست کی تو اللہ کی طرف سے یہ جواب آیا: قال قد اوتیت سؤلك يموسى (اے موسیٰ، تم کو تمہارا سوال دے دیا گیا)

قرآن میں یہ واقعہ ماضی کی تاریخ کے طور پر نہیں آیا ہے اور نہ اس کا تعلق صرف ایک خاص شخصیت سے ہے۔ وہ ایک نصیحت ہے اور اس میں ہر سچے داعی کے لئے امید کا ایک پیغام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا ایک داعی اگر خدا سے ان چیزوں کو مانگے تو آج بھی خدا کی طرف سے آواز آئے گی کہ اے میرے بندے تجھ کو وہ چیز دے دی گئی جس کا تو نے سوال کیا تھا۔

20-077

دعوتی اسلوب

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو مصر کے بادشاہ فرعون کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا: تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔ (طٰہٰ ۴۳۔۴۴)

فرعون اپنے زمانہ کا ایک سرکش بادشاہ تھا اس کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے وقت کے نبی کو اپنے پیغام کے ساتھ اس کی طرف بھیجا تو انھیں یہ ہدایت دی کہ تم فرعون سے نرم انداز میں اپنی بات کہنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت میں نرم انداز مطلق طور پر مطلوب ہے۔ مدعو کی طرف سے کوئی بھی سختی یا سرکشی داعی کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی دعوت میں نرمی اور شفقت کا انداز کھو دے۔

دوسری بات یہ کہ مدعو کا اثر لینا یا دعوت کو قبول کرنا اس پر منحصر ہے کہ اس سے نرم اور حکیمانہ انداز میں بات کہی گئی ہو۔ دعوتی کلام کی یہ شرط داعی کی ذمہ داری کو بتاتی ہے۔ گویا کہ داعی اگر نرم انداز اختیار نہ کرے تو اس کی دعوتی ذمہ داری ختم نہ ہوگی۔ ایسا داعی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مدعو تک اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اب یہ اس کا معاملہ ہے کہ وہ مانے یا نہ مانے۔

20-078

قرآن میں بصیرت

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پس برتر ہے اللہ، بادشاہ حقیقی، اور تم قرآن کے لینے میں جلدی نہ کرو جب تک اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ اور کہو کہ اے میرے رب میرا علم زیادہ کر دے۔ (طٰہٰ ۱۱۴)

اس آیت میں ربِّ زدنی علماً کی تشریح رب زدنی فہماً سے کی گئی ہے (تفسیر القرطبی) یعنی اے میرے رب میری سمجھ کو زیادہ کر دے۔ اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر رسول اللہ کے پاس آتے اور اس کو پڑھتے تو رسول اللہ اس کو

لینے میں جلدی کرتے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ کہیں اس کو بھول نہ جائیں۔ اس وقت آپ کو یہ تلقین کی گئی کہ الفاظ قرآن کی حفاظت کا ذمہ تو خود اللہ نے لے رکھا ہے اس لئے وہ کسی حال میں ضائع ہونے والا نہیں۔ تم کو الفاظ کے معانی پر زیادہ توجہ دینا چاہئے اور متن قرآن کے فہم میں اضافہ کی دعا کرتے رہنا چاہئے۔

اس ہدایت کا تعلق صرف پیغمبر سے نہیں ہے بلکہ آپ کی امت سے بھی ہے۔ پوری امت کو یہ جاننا چاہئے کہ الفاظ قرآن یا متن قرآن کی حفاظت تو بہر حال ہو کر رہے گی۔ کیوں کہ اس کا ذمہ اللہ نے خود لے لیا ہے۔ اہل ایمان کو سب سے زیادہ توجہ جس چیز پر دینا ہے وہ قرآن کے معانی میں فہم و بصیرت حاصل کرنا ہے اور اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا ہے۔ کیوں کہ قرآن کا فہم یا اس میں گہری بصیرت کسی آدمی کی صرف اپنی کوشش سے ملے گی۔ وہ اپنے آپ کسی کو حاصل ہونے والی نہیں۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امت میں تحفیظ القرآن کے مدارس سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ ان کے درمیان تفہیم القرآن کے ادارے قائم کئے جائیں۔ قرآن کا حفظ بھی اگرچہ ضروری ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ لوگوں کو قرآن کا فہم حاصل ہو، وہ قرآن کے معانی میں زیادہ سے زیادہ بصیرت اور تفقہ کے مالک بنیں۔

قرآن میں دوسرے مقام پر اسی طرح کے پس منظر میں کہا گیا ہے کہ: ان علینا جمعه (القیامہ ۱۷) اور یہاں فرمایا: قل رب زدنی علماً (طٰہٰ ۱۱۴) دونوں آیتوں کو ملایا جائے تو اس کا مطلب بنتا ہے کہ قرآن کو جمع کرنا اور اس کو محفوظ رکھنا اللہ کی ذمہ داری ہے، اور قرآن میں فہم و بصیرت حاصل کرنا اور اس میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا انسان کی ذمہ داری۔

20-079

رزقِ رب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے

ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے (طٰہٰ ۱۳۱)

اس آیت کا خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ ایک عمومی ہدایت ہے اور اس کا تعلق تمام اہلِ ایمان سے ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس میں تمام اہل ایمان کے لئے ایک اہم رہنمائی ہے، خواہ وہ کسی بھی دور یا کسی بھی نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

ایک آدمی جب پوری سنجیدگی کے ساتھ ایمان اور دعوت کی زندگی اختیار کرتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی زندگی مشکلات کی اور تنگی کی زندگی بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان اور دعوت سے بے پرواہو کر اپنی زندگی بنائیں وہ عام طور پر خوش حال اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے درمیان یہ فرق دراصل ان کے طرز زندگی کی قیمت ہے۔ مؤمن اور داعی ایک بااصول انسان ہوتا ہے۔ وہ ایک بااصول زندگی گزارتا ہے۔ اس کے مقابلے میں غیر مومن اور غیر داعی کی زندگی ایک بے اصول زندگی ہوتی ہے۔ یہی فرق دونوں کی زندگی میں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ ایک کو اصول پسندی کی قیمت ملتی ہے اور دوسرے کو بے اصولی کا طریقہ اختیار کرنے کی قیمت۔

مومن اور داعی کو اگر دنیا کی ظاہری رونقیں نہ ملی ہوں تو اس کو اس پر غم نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کو عین اسی وقت اس سے بھی زیادہ بڑی ایک چیز ملی ہوئی ہوتی ہے، اور وہ قرآن کے مطابق، رزق رب (طٰہٰ ۱۳۱) ہے۔ رزق رب سے کیا مراد ہے، اس سے مراد وہ ربانی احساسات ہیں جو اللہ کی توفیق سے ایسے آدمی کو ملتے ہیں۔ مشکلات و مسائل اس کے اندر عجز پیدا کر کے اس کو اللہ سے جوڑتے ہیں۔ مادی راحتوں کی کمی اس کے لئے جنت کی یاد کا سبب بن جاتی ہے۔ لوگوں کی مخالفتیں اس کے اندر رجوع الی اللہ کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ زندگی کے تلخ تجربات اس کی روحانیت کو مسلسل بیدار کرتے رہتے ہیں۔ دنیوی ساز و سامان کی کمی اس کو زیادہ سے زیادہ خدا سے

قریب کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

21-080

کائنات کی تخلیق

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔ (الانبیاء ۳۰)

رتق کے معنی کسی چیز کا منھ بند (منضم الاجزاء) ہونا ہے اور فتق کا مطلب اس کا کھل جانا ہے۔ غالباً اس سے زمین و آسمان کی وہ ابتدائی صورت مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ جدید سائنسی تحقیق کے مطابق زمین و آسمان کا تمام مادہ ابتداءً ایک بہت بڑے گولے (سپر ایٹم) کی صورت میں تھا۔ معلوم طبیعاتی قوانین کے مطابق اس وقت اس کے تمام اجزاء اپنے اندرونی مرکز کی طرف کھنچ رہے تھے۔ اور انتہائی شدت کے ساتھ باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس گولے کے اندر ایک دھماکہ ہوا اور اس کے اجزاء اچانک بیرونی سمت میں پھیلنا شروع ہوئے۔ اس طرح بالآخر وہ وسیع کائنات بنی جو آج ہمارے سامنے موجود ہے۔

ابتدائی مادی گولے (سپر ایٹم) میں یہ غیر معمولی واقعہ بیرونی مداخلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس طرح آغاز کائنات کی یہ تاریخ واضح طور پر ایک ایسی ہستی کو ثابت کرتی ہے جو کائنات کے باہر اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور جو اپنی ذاتی قوت سے کائنات کے اوپر اثر انداز ہوتی ہے۔ رتق اور فتق کے اس عمل کے دوران ایک اور انتہائی غیر معمولی واقعہ ہوا۔ وہ یہ کہ وسیع کائنات میں زمین جیسا ایک استثنائی کرہ وجود میں آیا اور پھر اس کرہ کے اوپر انتہائی استثنائی طور پر پانی جیسا سیال مادہ بہت بڑی مقدار میں پھیل گیا جو زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ہماری دنیا میں ہر جاندار چیز سب سے زیادہ جس چیز سے مرکب ہوتی ہے وہ پانی ہے، پانی نہ ہو تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ پانی

ہماری زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ وسیع کائنات میں استثنائی طور پر صرف ایک مقام پر پانی کا پایا جانا واضح طور پر "خصوصی تخلیق" کا پتہ دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کائنات کا ایک خالق ہے جس نے اپنے باشعور منصوبہ کے تحت اسے ایک وقت خاص میں پیدا کیا۔

22-081

ہدایت پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیا، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان کو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے۔ اور وہاں ان کی پوشاک ریشم ہوگی۔ اور ان کو پاکیزہ قول کی ہدایت بخشی گئی تھی۔ اور ان کو خدائے حمید کا راستہ دکھایا گیا تھا۔ (الحج ۲۳۔ ۲۴)

حق کا تعارف کسی آدمی کو اصلاً الفاظ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ الفاظ میں مختلف تشریح اور تعبیر کی اتنی زیادہ گنجائش ہے کہ صرف وہی آدمی اس سے رہنمائی لے سکتا ہے جو اس معاملہ میں آخری حد تک سنجیدہ ہو۔ اسی لئے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی کتاب اگرچہ حق ہے مگر وہ انھیں لوگوں کے لئے ہدایت بنتی ہے جو کھلے ذہن کے ساتھ اس سے ہدایت لینے کے حریص ہوں۔

مزید یہ کہ اس دنیا میں ہر طرف پر فریب الفاظ کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہاں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حق سے بچھڑے ہوئے لوگ غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ایمان کی صداقت کو پہچاننا بلاشبہہ سخت مشکل کام ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ ایمان کے اس راستہ پر عملاً اپنے آپ کو ڈال دیا جائے۔

یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جن کو اقوال کے پر شور ہنگاموں میں قول طیب کو پانے کی توفیق ملی۔ جنھوں نے راستوں کے ہجوم میں صراط حمید کو دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ جو لوگ دنیا میں اس عظیم لیاقت کا ثبوت دیں وہ انسانیت کے سب سے زیادہ قیمتی لوگ ہیں یہی لوگ اس قابل ہیں کہ انھیں جنت کے ابدی باغوں میں بسایا جائے۔

22-082

قربانی کی حقیقت

قرآن میں قربانی کے احکام بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ :اور اللہ کو قربانی کے ان جانوروں کا نہ گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون بلکہ اللہ کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔اس طرح اللہ نے ان کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، تا کہ تم اللہ کی بخشی ہوئی ہدایات پر اس کی بڑائی بیان کرو اور نیکی کرنے والوں کو خوش خبری دے دو۔(الحج ۳۷)

قربانی کا فعل جانور پر کیا جاتا ہے مگر آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ حقیقۃً جانور کی قربانی نہیں ہے بلکہ خود انسان کی قربانی ہے۔جانور کو ذبح کرنے والا آدمی دراصل عمل کی زبان میں یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو تیرے مشن کے لئے قربانی کی حد تک وقف کر دیا۔ تو میرے اس ارادہ کو قبول فرما۔

قربانی کا طریقہ اس لئے مقرر نہیں کیا گیا ہے کہ خدا کو گوشت اور خون کی ضرورت ہے۔ قربانی تو صرف ایک علامتی فعل ہے۔ جانور کی قربانی اس انسان کی ایک ظاہری تصویر ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے لئے ذبح کر چکا ہے۔ یہ دراصل خود اپنا ذبیحہ ہے جو جانور کے ذبیحہ کی صورت میں ممثل ہوتا ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے لئے جانور کی قربانی خود اپنی قربانی کے ہم معنیٰ بن جائے۔

22-083

دفاعی جنگ

قرآن میں اہل ایمان کو جنگ کی اجازت دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: (لڑنے کی آجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جارہی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے۔ صرف اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے

تو خانقاہیں اور گرجا اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ڈھادئے جاتے۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے۔ بے شک اللہ زبردست ہے، زور والا ہے۔ (الحج ۳۹۔۴۰)

قرآن کی یہ آیت اور اس طرح کی دوسری آیتیں (مثلاً البقرہ ۱۹۰) اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں صرف اپنے دفاع کے لئے جنگ کی اجازت ہے، اسلام میں جارحانہ جنگ کی بالکل اجازت نہیں۔ مزید یہ کہ کوئی قوم اگر جارحیت کرے تب بھی فوراً اس سے جنگ نہیں چھیڑ دی جائے گی۔ بلکہ ہر ممکن کوشش کے ذریعہ یہ تدبیر کی جائے گی کہ جنگ ٹل جائے اور لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ تاہم اگر فریق ثانی آخری حد تک جنگ پر تل جائے تو آخری چارہ کار کے طور پر اس سے جنگ کی جائے گی۔

مزید یہ کہ دفاعی جنگ بھی صرف فریق ثانی کی فوج سے لڑی جائے گی۔ عام شہریوں سے ہرگز کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح یہ جنگ صرف اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ بالکل ضروری ہے، جنگ کو انتقام تک لے جانا اسلام میں جائز نہیں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب، فکر اسلامی اور مطالعۂ حدیث)

23-084

فلاح پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یقیناً فلاح پائی ایمان والوں نے جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ اور جو زکوۃ ادا کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوا اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین میں ہوں کہ ان پر وہ قابل ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ چاہیں تو وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کی وراثت پائیں گے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (المؤمنون ۱۔۱۱)

خدا کی اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو صاحب ایمان ہو۔ جو کسی اور والا نہ ہو کر ایک اللہ والا بن جائے۔ جس کی زندگی اندر سے باہر تک ایمان میں ڈھل گئی ہو۔

جب کسی شخص کو ایمان ملتا ہے تو یہ سادہ سی بات نہیں ہوتی۔ یہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اب وہ اللہ کی عبادت کرنے والا اور اس کے آگے جھکنے والا بن جاتا ہے۔ اس کی سنجیدگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ بے فائدہ مشاغل میں وقت ضائع کرنا اس کو ہلاکت معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ خدا کے نام پر نکالتا ہے۔ اور اس سے ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے۔ وہ اپنی شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھنے والا بن جاتا ہے۔ اور اس کو انھیں حدود کے اندر استعمال کرتا ہے جو خدا نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔ وہ دنیا میں ایک ذمہ دار آدمی کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ دوسرے کی امانت میں وہ کبھی خیانت نہیں کرتا۔ کسی سے جب وہ کوئی عہد کر لیتا ہے تو وہ کبھی اس کے خلاف نہیں جاتا۔ جن لوگوں کے اندر یہ خصوصیات ہوں وہ اللہ کے مطلوب بندے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے خدا نے جنت الفردوس کی معیاری دنیا تیار کر رکھی ہے۔ موت کے بعد وہ اس کی فضاؤں میں داخل کر دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر وہ اس کے اندر عیش کرتے رہیں۔

23-085

خدائی رحمت میں حصہ پانے والے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال اور اولاد دئے جا رہے ہیں تو ہم ان کو فائدہ پہنچانے میں سرگرم ہیں بلکہ وہ بات نہیں سمجھتے۔ بے شک جو لوگ اپنے رب کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کانپتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہ لوگ بھلائیوں کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں اور وہ ان پر پہنچنے والے ہیں سب سے آگے۔ (المؤمنون ۵۵-۶۱)

ایک آدمی کو دنیا کی ترقی اور مادی ساز و سامان مل رہا ہو تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ ایک کامیاب انسان ہے اور یہ خدا کی رحمتیں ہیں جو اس کے اوپر نازل ہو رہی ہیں۔ مگر مادی ترقیاں کسی کے لئے اس بات کی پہچان نہیں ہیں کہ وہ خدا کا محبوب بندہ ہے اور خدا اس پر اپنی نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ مادی ساز و سامان اس دنیا میں امتحان کے لئے ہوتا ہے نہ کہ انعام کے لئے۔

کسی آدمی کو اس دنیا میں خدا کی نعمتیں ملنے کی پہچان یہ ہے کہ ـــــ دنیا کے واقعات اس کو خدا کی یاد دلانے والے بن جائیں۔ دنیا میں زندگی گزارتے ہوئے اس پر خدا سے خوف اور محبت کے تجربات گزرتے رہیں۔ دنیا اس کے لئے ایسی نشانیوں کا مجموعہ بن جائے جس میں اس کو خدا کے جلوے دکھائی دینے لگیں۔ وہ خدا کو ایک ایسی ہستی کے روپ میں دریافت کر لے جو ہر قسم کے شرک سے بالاتر ہو۔ اس کو دنیا میں جو کچھ ملے اس کو وہ ذاتی لیاقت کا نتیجہ سمجھنے کے بجائے براہ راست خدا کا عطیہ سمجھے۔ اس کا یہ احساس اتنا زیادہ بڑھا ہوا ہو کہ جب وہ اپنی کمائی میں سے کسی ضرورت مند کو کچھ دے تو وہ اس احساس سے کانپ رہا ہو کہ یہ میں اپنا مال نہیں دے رہا ہوں بلکہ میں خدا کی ایک امانت کو خدا کے بندے تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ حقیقت ہر لمحہ اس کے ذہن میں تازہ رہتی ہو کہ وہ آخر کار مرنے والا ہے اور خدا کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونے والا ہے۔

جو لوگ اس احساسات کے ساتھ دنیا میں جئیں وہی خدا کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ ان کی یہ حالت اس بات کی پہچان ہے کہ انھیں صبح و شام خدا کی رحمتیں پہنچ رہی ہیں۔ وہ دنیا میں بھی کامیاب ہیں اور آخرت میں بھی کامیاب۔

23-086

ایک معاشرتی حکم

مدینہ میں حضرت عائشہ صدیقہ پر کچھ لوگوں نے ایک بے ہودہ الزام لگایا اور اس کی خوب اشاعت کی۔ اس الزام تراشی کے تقریباً ایک مہینہ بعد حضرت عائشہ کی برأت میں سورہ النور اتری۔ اس میں اللہ نے فرمایا: جن لوگوں نے یہ طوفان برپا کیا وہ تمہارے اندر ہی کی ایک جماعت

ہے۔ تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ ان میں سے ہر آدمی کے لئے وہ ہے جتنا اس نے گناہ کمایا۔ اور جس نے اس میں سب سے بڑا حصہ لیا اس کے لئے عذاب ہے۔ جب تم لوگوں نے اس کو سنا تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے ایک دوسرے کی بابت نیک گمان کیوں نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلا ہوا بہتان ہے۔ (النور ۱۱۔ ۱۲)

حضرت عائشہ صدیقہ پر جب الزام لگایا تو پھیلانے والوں نے اس کو اتنا زیادہ پھیلایا کہ سارے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ حضرت عائشہ خود اس معاملے میں بالکل خاموش تھیں۔ انھوں نے اس کے بارے میں کوئی بیان نہیں دیا۔ حتی کہ جب ان سے پوچھا گیا تو اس کے بعد بھی انھوں نے اپنی زبان سے یہ کہنے سے انکار کر دیا کہ: واللہ ما قارفت۔

اب واحد صورت یہ تھی کہ قرآن میں اس کے بارے میں حکم اترے۔ مگر جب قرآن میں سورہ النور اتری تو اس میں بھی اس قسم کے تردیدی الفاظ نہیں تھے کہ: ما قارفت عائشہ۔ اس کے بجائے اس جھوٹ کی تردید کے لئے صرف یہ کہا گیا کہ "جو لوگ یہ افک (بے ہودہ بات) لائے ہیں۔ دوسری طرف اہل ایمان سے کہا گیا کہ تم نے جب اس بے ہودہ بات کو سنا تو تم نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ: سبحنك هذا بهتان عظيم (النور ۱۶)

اس سے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی الزام تراشی کے معاملہ میں مسلم معاشرہ کا طریقہ کیسا ہونا چاہئے۔ ایک طرف اس کو ایسا ہونا چاہئے کہ جب کوئی غیر سنجیدہ آدمی محض قیاس کی بنیاد پر کسی کے خلاف سنگین الزام لگائے تو سننے والوں کو چاہئے کہ وہ سنتے ہی فوراً کہہ دیں کہ یہ ایک بہتان ہے، اور کسی کو حق نہیں کہ وہ حقیقی شرعی ثبوت کے بغیر کسی کے خلاف اس قسم کی سنگین الزام تراشی کرے۔ دوسری طرف جس شخص کے اوپر اس قسم کے بے ہودہ الزام لگایا گیا ہے اس سے یہ تقاضا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ برہنہ الفاظ میں اس کی تردید کرے۔ اس کا یہ کہنا کہ یہ ایک بے ہودہ بات ہے، یہی کافی ہے کہ اس کو اس معاملے میں پوری طرح بری الذمہ مان لیا جائے۔

جو لوگ اس قسم کی بے ہودہ باتیں اپنی زبان سے نکالیں اور جو لوگ اس کو سن کر اسے پھیلانا شروع کر دیں وہ قرآن کے الفاظ میں اشاعت فاحشہ کے مجرم ہیں۔ ان کے لئے خدا نے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کا اعلان کیا ہے۔ (النور ۱۹)

24-087

زمین میں خلافت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار دے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لئے ان کے دین کو جما دے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اور ان کی خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔ (النور ۵۵)

آیت میں استخلاف (خلیفہ بنانے) کا لفظ ہے۔ خلیفہ کے معنی عربی زبان میں جانشین یا بعد کو آنے والے کے ہیں۔ استخلاف یا خلیفہ بنانا یہ ہے کہ ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو اس کی جگہ غلبہ اور استحکام عطا کیا جائے ـــــ غلبہ دراصل خدائی امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ خدا ایک کے بعد ایک، ہر قوم کو زمین میں غلبہ دیتا ہے۔ اور اس طرح ہر ایک کو جانچتا ہے۔ سچے اہل ایمان کے لئے یہ غلبہ امتحان کے ساتھ ایک انعام بھی ہے۔

اس آیت سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ غلبہ اور اقتدار اہل ایمان کے عمل کا نشانہ نہیں۔ وہ ایک خدائی انعام ہے جو ایمان اور عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کی مومنین کی جماعت کو دیا جاتا ہے۔

اس غلبہ کا مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو زمین میں استحکام عطا کیا جائے۔ ان کو یہ موقع دیا جائے کہ وہ دشمنان حق کے اندیشوں سے مامون ہو کر رہ سکیں۔ وہ آزادانہ طور پر خدا کی عبادت کریں۔ اور صرف ایک خدا کے بندے بن کر زندگی گزاریں۔ اہل ایمان کے غلبہ کی یہ حالت

اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ خدا کے شکر کرنے والے بنے رہیں۔ اور تقویٰ کی کیفیت کو نہ کھوئیں۔

25-088

عالمی کتاب

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو۔ وہ جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔ اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ایک اندازہ مقرر کیا۔ (الفرقان ۱۔۲)

قرآن کے مختلف بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے تمام اقوامِ عالم کے لئے بھیجی گئی۔ یہی بات دوسرے مقام پر پیغمبر اسلام کی نسبت سے اس طرح کہی گئی ہے: اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سبا ۲۸)

قرآن اصلاً عربی زبان میں ہے۔ وہ ابتداءً عرب میں اترا مگر جہاں تک اس کے پیغام کا تعلق ہے، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پوری طرح عالمی اور آفاقی ہے۔ اس کا خطاب تمام اقوام عالم سے ہے نہ کہ کسی مخصوص قوم سے۔

قرآن کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی وقتی اور مقامی چیز نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ قرآن میں یہ خبر دی گئی ہے کہ انسان مر کر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ وہ حساب کتاب کے لئے آخرت کی عدالت میں حاضر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے جو تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ لین دین میں کامل انصاف کا طریقہ اختیار کرو۔ یہ بھی ایک ایسی تعلیم ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ اسی طرح قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی انسان اول کی اولاد ہیں۔

اس لیے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ نسل کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ یہ بھی ایک ایسی تعلیم ہے جو تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہے، وغیرہ۔

اسی طرح قرآن کی تمام تعلیمات عالمی اور آفاقی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ ماضی سے لے کر مستقبل تک تمام انسانوں کے لیے رہنمائی ہیں۔

25-089

خواہش پرستی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ پس کیا تم اس کا ذمہ لے سکتے ہو۔ یا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ تو محض جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ (الفرقان ۴۳۔۴۴)

کسی کو معبود بنانا یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اونچا درجہ دے دیا جائے۔ ہر دوسری باتیں غیر اہم ہوں اور وہ چیز سب سے زیادہ اہم۔ آدمی ہر دوسری بات کو نظر انداز کر سکتا ہو مگر اس چیز کو وہ نظر انداز نہ کر سکے۔ اس چیز کی بڑائی اس کے نزدیک اتنی زیادہ ہو کہ بقیہ سب کچھ اس کے نزدیک ہیچ ہو جائے۔ جب کوئی شخص اپنی خواہش کو اس قسم کا اونچا درجہ دے دے تو گویا کہ اس نے اس چیز کو اپنا معبود بنالیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ وہی انسان کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ سے ملتا ہے۔ اللہ کے سوا کسی اور سے اس کو کچھ ملنے والا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس حیثیت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اللہ کو اپنا سب کچھ سمجھے۔ وہ اللہ سے سب سے زیادہ ڈرے اور اسی سے سب سے زیادہ محبت کرے۔ اس کی زندگی میں سب سے بڑا درجہ صرف ایک اللہ کا ہو، اس کے سوا تمام چیزیں اس کی نظر میں چھوٹی ہو جائیں۔ اسی کا نام توحید ہے اور توحید کے بغیر کسی انسان کی نجات ممکن نہیں۔

جو لوگ اپنی خواہشات کو اپنا رہنما بنالیں وہ گویا حیوان کے مانند ہیں۔ حیوان کو حق اور ناحق

کی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی خواہش کو جانتا ہے اور اس کے پیچھے چلتا ہے۔ یہی حال اگر انسان کا ہو جائے تو انسان اور حیوان میں کیا فرق بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ایسا انسان جانور سے بھی زیادہ بدتر ہے کیوں کہ جانور پھر بھی اپنی تخلیق پر قائم ہے، جب کہ ایسا انسان گویا اپنے تخلیقی نقشے سے ہٹ گیا۔

25-090

رحمان کے بندے

قرآن میں اہل جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔ اور جو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب جہنم کے عذاب کو ہم سے دور رکھ۔ بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے۔ بے شک وہ برا ٹھکانہ ہے اور برا مقام ہے۔ اور وہ لوگ کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں۔ اور ان کا خرچ اس کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔ اور جو اللہ کے سوا کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے۔ اور وہ اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو قتل نہیں کرتے مگر حق پر۔ اور وہ بدکاری نہیں کرتے۔ اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو وہ سزا سے دوچار ہو گا۔ قیامت کے دن اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا۔ اور وہ اس میں ہمیشہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ در حقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اور جو لوگ جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے۔ اور جب کسی بیہودہ چیز سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ اور وہ ایسے ہیں کہ جب ان کو ان کے رب کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گرتے۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو ہماری بیوی اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ لوگ

ہیں کہ ان کو بالا خانے ملیں گے اس لئے کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور ان میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔ (الفرقان ۶۳۔۷۶)

قرآن کی ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو آخرت کی ابدی جنتوں میں جگہ ملے گی۔ یہاں چند آیتوں میں ایسے لوگوں کی بنیادی صفتوں کو بتادیا گیا ہے۔ ان آیتوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ کس طرح کا ہوتا ہے اور ان انسانوں کے ساتھ ان کا سلوک کیسا ہوتا ہے جن کے درمیان وہ زندگی گزار رہے ہوں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنتی اوصاف ان لوگوں میں پیدا ہوتے ہیں جو دنیا میں اس احساس کے ساتھ رہیں کہ وہ خدائے رحمان ورحیم کے بندے ہیں۔ ان کی حیثیت خدا کے مقابلے میں عبد کی ہے۔ وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ وہ ہر لمحہ خدا کے ماتحت ہیں۔

دنیا میں خدا کا بندہ بن کر رہنے کی قیمت صرف ایک ہے، اور وہ صبر ہے۔ نفس کے مقابلے میں صبر، شیطان کے مقابلے میں صبر اور منفی جذبات کے مقابلے میں صبر۔ جو آدمی صبر کی یہ قیمت دینے کے لئے تیار ہو وہی موجودہ دنیا میں خدا پرستانہ زندگی پر قائم رہے گا۔ جنت کی قیمت صبر ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص جنت والے عمل نہیں کر سکتا، اس لئے صبر کے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل بھی نہیں ہو سکتا۔

حقیقی توبہ خود ایک عمل ہے، جو گناہ آدمی کے اندر حقیقی توبہ کی کیفیت پیدا کرے وہ گناہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اس کو نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جائے۔

25-091

برائی کے بدلے نیکی

قرآن میں بعض گناہوں کا اور ان کے اخروی انجام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کرے تو اللہ ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھلائیوں

سے بدل دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک کام کرے تو وہ درحقیقت اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ (الفرقان ۷۰۔۷۱)

اس آیت میں ایک غیر معمولی انعام کا ذکر ہے۔ اس میں صرف یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کی گناہوں کو معاف کر دے گا۔ بلکہ اس کے بجائے یہ فرمایا کہ اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا یعنی ان سے جو برائی سرزد ہوئی وہ سادہ طور پر صرف معاف نہ ہوگی بلکہ وہ برائی بجائے خود نیکی بن جائے گی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: "ان السیئات تبدل بحسنات" (تفسیر القرطبی ۱۳/۷۸)

یہاں دراصل مخصوص قرآنی اسلوب کے مطابق، بندے کی بات کو خدا کی طرف منسوب کر کے کہا گیا ہے۔ مذکورہ قسم کے اہل ایمان دراصل اپنی توبہ کے ذریعہ اپنی سیئات کو حسنات میں بدل چکے ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ ان کی اس "تبدیلی" کو قبول کر کے خود بھی ان کی سیئات کو ان کی حسنات کے خانے میں درج کر دے گا۔ یہ معاملہ اللہ کی خصوصی توفیق سے ہوگا۔ اس لئے اس کو اللہ کی طرف منسوب فرمایا۔

یہ خدا کا وہ بندہ ہے جس سے بشری تقاضے کے تحت کوئی گناہ ہو گیا، اس کے بعد وہ احساسِ گناہ سے تڑپ اٹھا۔ اس کے اندر نہایت گہرائی کے ساتھ توبہ اور رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ اس طرح خدا سے معافی مانگنے لگا کہ ایک طرف اس کی لرزتی ہوئی زبان پر اعتراف کے کلمات تھے اور دوسری طرف اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ اس کا یہ داخلی تجربہ اتنا شدید تھا کہ ایسا محسوس ہونے لگا گویا کہ وہ خدا کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے اور کسی درمیانی واسطے کے بغیر براہ راست طور پر اس سے مخاطب ہے۔

اس بندۂ خدا سے اگرچہ بظاہر ایک گناہ سرزد ہوا تھا۔ مگر اس کے بعد اس کی جو کیفیت ہوئی وہ اعلیٰ ترین ایمانی کیفیت تھی۔ اس کے گنہگار جسم کو اس کے مقدس آنسوؤں نے دھو کر پہلے سے بھی زیادہ پاک کر دیا۔ اس کی شخصیت اندر سے لے کر باہر تک ایک ربانی شخصیت بن گئی۔ وہ خدا

سے اتنا زیادہ قریب ہو گیا جتنا اس سے پہلے وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ تقویٰ، خشوع، انابت، تضرع اور اخبات جیسی اعلیٰ ایمانی صفات اس کے اندر کمال درجہ میں پیدا ہو گئیں۔ وہ اس نادر روحانی تجربہ سے دوچار ہوا جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: تعبد اللہ کانک تراہ (صحیح البخاری) یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

مذکورہ بندے سے جب بشری تقاضے کے تحت گناہ سرزد ہوا تو اپنے ظاہر کے اعتبار سے وہ ایک گناہ ہی تھا۔ مگر اس گناہ کے بعد اس کا جو نتیجہ اس کی شخصیت میں ظاہر ہوا وہ بجائے خود سب سے بڑی نیکی تھا۔ اس طرح بندے نے اگر چہ بظاہر ایک گناہ کیا تھا مگر اس کے بعد اس کی توبۂ نصوح نے اس گناہ کو بدل کر اس کو ان احوال تک پہنچا دیا جو نیکی کی اعلیٰ ترین قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب ایسا ہوا تو اللہ نے اس بندے کی "تبدیلی" کو حسنِ قبول عطا کرتے ہوئے یہ عنایت فرمائی کہ اس کی برائی کو نیکی کے خانے میں درج کر دیا۔

26-092

ایمان کی طاقت

قرآن کی سورہ الشعراء میں موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لئے مصر کے جادوگروں کو بلایا۔ جب تمام لوگ میدان میں اکٹھا ہوئے تو قرآن کے مطابق، جادوگروں اور فرعون کے درمیان یہ مکالمہ ہُوا: پھر جب جادوگر آئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لئے کوئی انعام ہے اگر ہم غالب رہے۔ فرعون نے کہا ہاں، اور تم اس صورت میں مقرب لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے۔ (الشعراء ۴۱۔۴۲)

یہ جادوگر جو آغاز میں مصر کے بادشاہ فرعون کے ساتھ اس قسم کی خوشامدانہ باتیں کر رہے تھے وہ بعد کو بالکل بدل گئے۔ مقابلے میں جب فرعون کو شکست ہوئی اور جادوگروں کے جادو کو حضرت موسیٰ کے عصا نے نگل لیا تو جادوگروں کا وہ حال ہوا جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: پھر جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا ہم ایمان لائے رب العالمین پر جو

موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ (الشعراء ۴۶۔۴۸)

جادوگروں کا یہ حال دیکھ کر فرعون سخت غصہ ہو گیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا: فرعون نے کہا، تم نے اس کو مان لیا اس سے پہلے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمہارا استاد ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے۔ پس اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھادوں گا۔ (الشعراء ۴۹):

اس کے بعد جادوگروں کا ردعمل اس سے بالکل مختلف تھا جس کا اظہار انھوں نے شروع میں فرعون کے ساتھ کیا تھا۔ قرآن کا بیان ہے کہ: جادوگروں نے فرعون کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ کچھ حرج نہیں، ہم اپنے مالک کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری خطاؤں کو معاف کردے گا۔ اس لئے کہ ہم پہلے ایمان لانے والے ہے (الشعراء ۵۰۔۵۱)

جادوگروں کے اندر یہ فرق کیسے پیدا ہوا۔ وہی جادوگر جو مقابلہ سے پہلے فرعون سے خوشامد کی باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مقابلہ کے بعد جرأت اور قربانی کی زبان بولنا شروع کر دیا۔ یہ فرق ایمان کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ مقابلہ سے پہلے جادوگر عام انسان تھے جن کو حق کی معرفت نہیں ملی تھی۔ مگر مقابلہ کے بعد انھیں حق کی معرفت حاصل ہو گئی۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے کردار میں فُرق پیدا کر دیا۔ حق کی معرفت کسی انسان کے لئے سب سے بڑا تجربہ ہے۔ حق کی معرفت ایک عام انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتی ہے۔ اس کے بعد آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ ہیرو والا کردار ادا کرے، وہ بڑی سے بڑی قربانی کا بھی یقین اور حوصلہ کے ساتھ استقبال کر سکے۔

26-093

شاعر کا مقام

عرب کے لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے تھے۔ اس کی تردید کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور شاعروں کے پیچھے بے راہ لوگ چلتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے

کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو وہ کرتے نہیں۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور انھوں نے اللہ کو بہت یاد کیا اور انھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور ظلم کرنے والوں کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے۔ (الشعراء ۲۲۴۔۲۲۷)

قرآن کی یہ آیت اصلاً مخالفین رسول کے پروپیگنڈے کے جواب میں آئی ہے۔ تاہم اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت اور انسانی اصلاح کا کام شعر وشاعری کے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ شعر وشاعری کا طریقہ کسی سنجیدہ مشن کے لئے ہرگز مفید نہیں ہے۔ کوئی شاعر اگر اپنے شاعرانہ کلام کے ذریعہ کچھ لوگوں کو اکٹھا کرلے تو یقینی طور پر وہ غیر سنجیدہ لوگ ہوں گے۔ ایسے لوگوں کے ذریعہ تعمیر واصلاح کا کوئی گہرا کام نہیں کیا جا سکتا۔

27-094

سیاسی ٹکراؤ نہیں

قرآن میں حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت سلیمان نے ملکۂ سبا کے پاس ایک خط بھیج کر اس سے اطاعت کا مطالبہ کیا۔ ملکۂ سبا نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا۔ درباریوں نے اطاعت قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ملکۂ سبا نے اس پر خطر رائے سے اختلاف کیا: اس نے کہا کہ بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہ اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں اور یہی یہ لوگ کریں گے۔ (النمل ۳۴)

ملکۂ سبا کے سامنے جب یہ مسئلہ آیا تو اس نے اس معاملہ کو خالص حقیقت پسندانہ انداز سے دیکھا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم سلیمان کی طاقت سے ٹکرائیں تو زیادہ امکان یہ ہے کہ ہم ہاریں گے اور پھر ہمارے ساتھ وہی کیا جائے گا جو ہر غالب قوم مغلوب قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم اطاعت قبول کرلیں تو ہم تباہی سے بچ جائیں گے۔

ملکۂ سبا نے اپنی اس گفتگو میں حضرت سلیمان کے بارہ میں کہا کہ: وکذالك یفعلون (النمل ۳۴) یعنی سلیمان بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ تردید نہیں فرمائی کہ سلیمان

تو پیغمبر ہیں وہ ایسا کرنے والے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیاسی ٹکراؤ کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں۔ ایسی حالت میں ایسا کرنا درست نہیں کہ کوئی جماعت طاقتور حکمراں سے ٹکرا جائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو پھر وہی ہو گا جس کی طرف ملکۂ سبا نے اپنے مذکورہ جواب میں اشارہ کیا ہے۔ ایسے گروہ کو جاننا چاہئے کہ سیاسی ٹکراؤ کے بعد جب وہ حکمراں کے ظلم کی شکایت کرے گا تو ایسی شکایت کی قیمت نہ بندوں کی نظر میں ہو گی نہ خدا کی نظر میں۔

28-095

غلطی کی معافی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ قرآن میں اس طرح بیان ہوا ہے: اور شہر میں موسیٰ ایسے وقت داخل ہوئے جب کہ شہر والے غفلت میں تھے تو اس نے وہاں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے پایا۔ ایک موسیٰ کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا دشمنوں میں سے تھا۔ تو جو اس کی قوم میں سے تھا اس نے اس کے خلاف مدد طلب کی جو اس کے دشمنوں میں سے تھا۔ پس موسیٰ نے اس کو گھونسا مارا پھر اس کا کام تمام کر دیا۔ موسیٰ نے کہا کہ یہ شیطان کے کام سے ہے۔ بے شک وہ دشمن ہے کھلا گمراہ کرنے والا۔ اس نے کہا کہ اے میرے رب، میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ پس تو مجھ کو بخش دے تو خدا نے اس کو بخش دیا۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (القصص ۱۵۔۱۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر غلطی خدا کے یہاں معاف ہو سکتی ہے۔ کسی آدمی سے کوئی غلطی ہو جائے اس کے بعد وہ فوراً چونک اٹھے۔ وہ اپنی غلطی کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے دل سے معافی کا طلب گار ہو۔ وہ غلطی کرنے کے بعد اس کو چھپانے یا اس کا جواز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرے تو خدا اس کی غلطی کو معاف کر دے گا، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ غلطی کرنے کے بعد غلطی کا شدید اعتراف بھی بجائے خود ایک نیکی ہے۔ ایسی نیکی برائی کو ڈھانپ لیتی ہے۔ غلطی کرنے کے بعد سرکشی کرنا جرم میں اضافہ کرتا ہے اور غلطی کے بعد شرمسار ہونا غلطی کو مٹا دیتا ہے۔

28-096

بنیادی انسانی صفت

حضرت موسیٰ جب مصر سے نکل کر مدین پہنچے اور ایک بزرگ کی بکریوں کو پانی پلایا تو یہ واقعہ ان کے لئے اس بزرگ کے گھر پہنچنے کا ذریعہ بن گیا۔ اپنے ایک اہل خانہ کے کہنے پر انہوں نے حضرت موسیٰ کو اپنے گھر کے کام کے لئے رکھ لیا۔ اس وقت کہنے والے نے حضرت موسیٰ کے تعارف میں جو کچھ کہا وہ قرآن میں اس طرح نقل ہوا ہے: ان میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو ملازم رکھ لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہ وہی ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔ (القصص ۲۶)

مذکورہ بزرگ کے خاندان کو مختصر تجربے سے یہ معلوم ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ محنتی بھی ہیں اور دیانت دار بھی۔ مذکورہ جملے میں حضرت موسیٰ کی ان دو صفتوں کا ذکر نہایت بامعنی ہے۔ اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ بہتر کارکن کون ہے اور کسی کارکن کے انتخاب میں کس معیار کو سامنے رکھنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں انسانی صفات، امانت اور قوت (honesty & hard working) تمام ضروری صفات کی جامع ہیں۔ آدمی کے انتخاب کے لئے معیار مقرر کرنا ہو تو ان دو لفظوں سے بہتر کوئی معیار نہیں ہو سکتا۔ کسی آدمی کا محنتی ہونا اس بات کا ضامن ہے کہ اس کو جو کام سونپا جائے گا اس کو وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ انجام دے۔ وہ کبھی اپنی کوشش میں کمی نہیں کرے گا۔ اسی طرح آدمی کا دیانت دار ہونا اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ وہ کبھی دھوکا نہیں دے گا۔ وہ ہر اعتماد میں پورا اترے گا۔

28-097

دہرا اجر والے

قرآن میں اہل کتاب کے اسلام کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: یہ لوگ ہیں کہ ان کو

ان کا اجر دہرا دیا جائے گا اس پر کہ انھوں نے صبر کیا۔ اور وہ برائی سے بھلائی کو دفع کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب وہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ تم کو سلام، ہم بے سمجھ لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ (القصص ۵۴-۵۵)

اس آیت میں جس دوہرے اجر کا ذکر ہے اس کا تعلق صرف اہل کتاب سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک عام حقیقت ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ ایک عرصہ تک کسی خاص گروہ سے وابستہ رہیں۔ وہ اس کے ساتھ تعصب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا ایک محدود ذہنی سانچہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنی مانوس سچائی کو آخری اور اصلی سچائی سمجھ لیتے ہیں۔ وہ اپنے ذہنی سانچے کو توڑ کر کسی نئی حقیقت کو سمجھنے سے عاجز رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو شخص اس صفت کا ثبوت دے کہ وہ اپنے ذہنی تعصبات کو توڑ کر مجرد سچائی کو پہچان سکتا ہے وہ اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو دہرا اجر دیا جائے۔ تاہم یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اپنے آپ کو اس قابل رکھنے کے لئے آدمی کو صبر کے مشکل مرحلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔

یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن کو ان اثرات سے پاک رکھا تھا جس کے بعد آدمی حق کی معرفت کے لئے نااہل ہو جاتا ہے۔ یہ وہ تاریخی اور سماجی عوامل ہیں جو آدمی کے ذہن میں خدائی دین کو گروہی دین بنا دیتے ہیں۔ آدمی کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اس دین کو پہچان سکے جو اس کو اپنے گروہ سے ملا۔ وہ ایسے دین کو پہچاننے میں ناکام رہے جو اس کے اپنے گروہ کے باہر سے اس کے پاس آئے۔ ان اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے آدمی کو زبردست نفسیاتی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کو صبر سے تعبیر فرمایا۔ ایسے لوگوں کو دہرا اجر دیا جائے گا۔ ایک ان کی قربانی کا کہ انھوں نے اپنے سابقہ ایمان کو گروہی ایمان بننے نہیں دیا۔ اور دوسرے ان کی جوہر شناسی کا کہ ان کے سامنے نیا پیغمبر آیا تو انہوں نے اس کو پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہو گئے۔

جن لوگوں کے اندر حق شناسی کا مادہ ہو انھیں کے اندر اعلیٰ اخلاقی اوصاف پرورش پاتے
ہیں۔ لوگ ان کے ساتھ برائی کریں تب بھی وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں۔ وہ دوسروں
کی مدد کرتے ہیں تاکہ خدا ان کی مدد کرے۔ ان کا طریقہ اعراض کا طریقہ ہوتا ہے نہ کہ لوگوں
سے الجھنے کا طریقہ۔

28-098

ہدایت یابی کے لئے قانون الٰہی

پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم جس کو چاہو اس کو ہدایت
نہیں دے سکتے۔ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ خوب جانتا ہے جو ہدایت
قبول کرنے والے ہیں۔ (القصص ۵۶)

داعی پر یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں تک حق کی بات پہنچانے کے لئے اپنی ساری کوشش
صرف کرے، وہ اپنی کوششوں میں کوئی کمی نہ کرے۔ اس کے بغیر وہ اپنی دعوتی ذمہ داری سے
سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ مگر جہاں تک قبول حق کا تعلق ہے، وہ داعی کے چاہنے سے، حتی کہ اس کی
دعاؤں سے بھی نہیں ہو سکتا۔ قبول حق کا تعلق یک طرفہ طور پر مدعو کی اپنی ذات سے ہے نہ کہ
داعی کی ذات سے۔

ہدایت دینے والا اللہ ہے ـــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت پانے کا تعلق اللہ کے اس
قانون سے ہے جو اس نے ہدایت یابی کے لئے مقرر فرمایا۔ اور وہ یہ ہے کہ آدمی کے اندر خود
ہدایت کی طلب موجود ہو۔ جس آدمی کے اندر ہدایت کی سچی طلب پائی جائے وہ حق کی تلاش میں
رہے گا۔ جب اس کے سامنے حق آئے گا تو وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرے گا وہ اس کے
لئے تیار رہے گا کہ جب ایک چیز کا حق ہونا معلوم ہو جائے تو کسی تحفظ ذہنی کے بغیر وہ اس کو قبول
کر لے۔ حق اس کو ملتا ہے جو حق کا طالب ہو۔ جس آدمی کے اندر طلب کی صفت موجود نہ ہو اس
کو کوئی بھی دوسری چیز ہدایت دینے والی نہیں۔

28-099

سزا سے پہلے تبلیغ

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک ان کی بڑی بستی میں کسی پیغمبر کو نہ بھیج لے جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ہم ہرگز بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں مگر جب کہ وہاں کے لوگ ظالم ہوں۔ (القصص ۵۹) دوسری جگہ یہی بات قرآن میں اس طرح آئی ہے: یہ اس وجہ سے کہ تمہارا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں کہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں۔ (الانعام ۱۳۲)

ان آیتوں میں خدا کا قانون بتایا گیا ہے جس کے تحت قوموں پر دنیا میں ہلاک کر دینے والا عذاب آتا ہے۔ اس قانون کے مطابق، کسی قوم پر ہلاکت والا عذاب صرف اس لئے نہیں آسکتا کہ وہ گمراہی میں مبتلا ہے یا وہ کسی گروہ سے مادی جھگڑوں کی وجہ سے اس کے اوپر ظلم وزیادتی کر رہی ہے۔ اس قسم کا دنیوی عذاب کسی قوم پر صرف اس وقت آتا ہے جب کہ اس کے درمیان حق کی دعوت اٹھے۔ اس دعوت کو اس کی تمام ضروری شرطوں کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے اتمام حجت تک پہنچائے۔ یہاں تک کہ اس کی غفلت اور اس کی بے خبری ٹوٹ جائے۔ اس کے باوجود وہ انکار اور سرکشی پر قائم رہے۔ مزید یہ کہ داعی اور اس کا ساتھ دینے والے حق پرست اس قوم کی بستیوں کو چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ جب یہ تمام شرطیں پوری ہو جائیں تو اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ اس کے اوپر ہلاکت والا عذاب آئے۔

ایک گروہ کو اگر یہ شکایت ہو کہ کوئی قوم اس کے اوپر ظلم کر رہی ہے اور اس کو اپنی زیادتیوں کا نشانہ بنا رہی ہے تو محض یہ بات کسی قوم کی ہلاکت کا سبب نہیں بن سکتی۔ ایسی حالت میں جو گروہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھ رہا ہے، خواہ وہ کتنی ہی بد دعائیں کرے۔ وہ اپنے ہر اجتماع میں یہ الفاظ دہرائے: اللهم اهلك الكفرة والمشركين، اللهم خذهم اخذ عزيز مقتدر. اللهم اهلكهم كما اهلكت عادا وثمودا، تو محض اس قسم کی بد دعاؤں کی بنا پر یہ نا ممکن ہے کہ مذکورہ قوم پر ہلاکت والا عذاب آجائے۔ اس قسم کے عذاب کا تعلق دعوت سے ہے نہ کہ محض ظلم سے۔

مذکورہ آیت میں ظلم سے مراد مادی نزاعات کی بنا پر پیش آنے والا ظلم نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ ظلم وسرکشی ہے جو دعوت حق کے خلاف کسی قوم کی طرف سے کی جائے۔

28-100

آخرت کا گھر

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور آخری انجام ڈرنے والوں کے لئے ہے۔ (القصص ۸۳)

آخرت کے گھر سے مراد آخرت کی جنت ہے۔ جنت کی آبادی میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کے سینے اپنی بڑائی کے احساس سے خالی ہوں۔ جو خدا کی بڑائی کو اس طرح پائیں کہ اپنی طرف انھیں چھوٹائی کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔

فساد یہ ہے کہ آدمی خدا کی اسکیم سے موافقت نہ کرے۔ وہ خدا کی دنیا میں خدا کی مرضی کے خلاف چلنے لگے۔ جو لوگ کبر سے خالی ہو جائیں وہ لازمی طور پر فساد سے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندر یہ اعلیٰ اوصاف پیدا ہو جائیں وہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے ابدی باغوں میں بسائے جائیں گے۔

علو کا مطلب خدا کے مقابلے میں سرکشی کرنا ہے۔ قول یا عمل سے اپنے آپ کو خدا کے برابر ٹھہرانا ہے۔ فساد یہ ہے کہ کوئی آدمی انسانوں کے مقابلے میں سرکش بن جائے۔ وہ انسانی معاملات میں ظلم اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے۔

29-101

آزمائش ضروری ہے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا۔ اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا ہے جو ان سے پہلے تھے، پس اللہ ان لوگوں کو جانچ کر رہے گا جو سچے ہیں اور وہ جھوٹوں کو بھی ضرور معلوم کرے گا (العنکبوت ۲۔۳)

آدمی کے مومن و مسلم ہونے کا فیصلہ معمول کے حالات میں کئے جانے والے عمل پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس عمل پر ہوتا ہے جو آدمی غیر معمولی حالات میں کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی حالات کیا ہیں۔ یہ وہ غیر معمولی مواقع ہیں جب کہ یہ کھل جاتا ہے کہ آدمی حقیقت میں وہ ہے یا نہیں جس کا دعوئی وہ اپنی زبان سے یا اپنے ظاہری عمل سے کر رہا ہے۔ جو لوگ غیر معمولی حالات میں ایمان و اسلام پر قائم رہنے کا ثبوت دیں وہی خدا کے نزدیک حقیقی معنوں میں مومن اور مسلم قرار پاتے ہیں۔

جانچ میں پورا اترنا، بالفاظ دیگر، قربانی کی سطح پر ایمان و اسلام والا بننا ہے۔ یعنی جب عام لوگ انکار رکر دیتے ہیں اس وقت تصدیق کرنا۔ جب لوگ شک کرتے ہیں اس وقت یقین کر لینا۔ جب اپنی انا کو کچلنے کی قیمت پر مومن بننا ہو اس وقت مومن بن جانا۔ جب ماننے میں سب کچھ بگڑتا ہوا نظر آئے اس وقت مان لینا۔ جب ہاتھ روکنے کے تقاضے ہوں اس وقت خرچ کرنا۔ جب فرار کے حالات ہوں اس وقت جمنے کا ثبوت دینا۔ جب اپنے آپ کو بچانے کا وقت ہو اس وقت اپنے آپ کو حوالے کر دینا۔ جب سرکشی کا موقع ہو اس وقت سر تسلیم خم کر دینا۔ جب سب کچھ لٹا کر ساتھ دینا ہو اس وقت خطرہ میں پڑ کر ساتھ دینا۔ ایسے غیر معمولی مواقع پر اندر والا انسان باہر آجاتا ہے۔ اس کے بعد کسی کے لئے یہ موقع نہیں رہتا کہ وہ فرضی الفاظ بول کر اپنے کو وہ ظاہر کرے جو کہ حقیقت میں وہ نہیں ہے۔

29-102

صفات مومن

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم اس کتاب کی تلاوت کرو جو تم پر وحی کی گئی ہے اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (العنکبوت ۴۵)

اس آیت میں "نماز برائیوں سے روکتی ہے" کا جملہ نماز کی پہچان ہے نہ کہ سادہ طور پر نماز کا نتیجہ۔ حقیقی نماز کی دوسری پہچان یہ ہے کہ آدمی کے اندر خدا کی یاد کی صفت پیدا ہو جائے اور خدا

کی یاد بلاشبہہ تمام نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی ہے۔

نماز کی ایک ظاہری صورت ہے اور دوسری چیز اس کی اسپرٹ ہے۔ جس آدمی کی زندگی میں نماز اس کی اسپرٹ کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ نماز میں اللہ اکبر (اللہ بڑا ہے) کی تکرار اس کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ نماز میں قرآن کی تلاوت اس کے اندر خدا کے شعور کو جگاتی ہے۔ نماز میں رکوع اور سجدہ اس کے اندر تواضع کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھنا اس کے لئے اجتماعیت کا سبق بن جاتا ہے۔ نماز کے خاتمہ پر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنا اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ اس کے سینے میں تمام دنیا کے لوگوں کے لئے سلامتی اور رحمت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

ذکر سے مراد خدا کی یاد ہے۔ جب آدمی کو خدا کی کامل معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جب وہ پوری طرح خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اوپر خدا کا تصور چھا جاتا ہے۔ اس کے اندر خدا کی یاد کا چشمہ بہہ پڑتا ہے۔ اس روحانی درجہ کو پہنچ کر آدمی کی زبان سے خدا کے لئے جو اعلیٰ کلمات نکلتے ہیں انھیں کا نام ذکر ہے۔ یہ ذکر بلاشبہہ اعلیٰ ترین عبادت ہے۔

29-103

صبر اور توکل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے ان کو ہم جنت کے بالا خانوں میں جگہ دیں گے۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ کیا ہی اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا۔ جنہوں نے صبر کیا اور جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (العنکبوت ۵۸۔۵۹)

اس آیت کے مطابق جنت اس انسان کے لئے ہے جو اپنے اندر دو قسم کی اخلاقی صفات رکھتا ہو ——— صبر اور توکل یہ دو صفتیں گویا کہ جنت کی قیمت ہیں۔ ان صفتوں کے بغیر کسی شخص کے لئے جنت کا داخلہ ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جنت اس اعلیٰ انسان کے لئے ہے جو دنیا کی زندگی میں اس بات کا ثبوت دے کہ وہ مثبت ربانی شخصیت کا حامل ہے۔ موجودہ دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی کو ناخوشگوار تجربات کے درمیان جینا ہوتا ہے۔ یہ حالات بار بار آدمی کے داخلی روحانی سکون کو برہم کرتے رہتے ہیں۔ وہ بار بار منفی جذبات کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں صرف وہ انسان اپنی داخلی روحانیت کو برقرار رکھ سکتا ہے جو صبر کی غیر معمولی صفت اپنے اندر رکھتا ہو۔ جو منفی حالات سے غیر متاثر رہ کر جئے، جو یک طرفہ اخلاقیات کے اصول پر زندگی گزارنے کا ثبوت دے سکے۔ ایسے ہی انسان کا نام صابر انسان ہے۔

توکل کی صفت آدمی کو تزلزل سے بچاتی ہے۔ وہ اس کو پر اعتماد زندگی عطا کرتی ہے۔ موجودہ دنیا میں بار بار ایسے حوصلہ شکن تجربات پیش آتے ہیں جو آدمی کی اندرونی شخصیت کو ہلادیں۔ کبھی آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ دوسروں کو اس سے زیادہ ملا ہوا ہے۔ کبھی وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ اس کے پاس جو اسباب ہیں وہ اس کے عزائم کی نسبت سے بہت کم ہیں۔ کبھی اس کے حالات اس کو حوصلہ شکنی کی طرف لے جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے احوال میں اللہ پر توکل ہی اس کا واحد سہارا بنتا ہے۔ وہ ظاہری حالات سے بے پرواہو کر توکل علی اللہ کے سہارے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ توکل ایک غیر معمولی ربانی صفت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ توکل آدمی کو جنت کا مستحق بنادیتا ہے۔

29-104

دنیا اور آخرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں ہے مگر ایک کھیل اور دل کا بہلاوا۔ اور آخرت کا گھر ہی اصل زندگی کی جگہ ہے، کاش کہ وہ جانتے۔ (العنکبوت ۶۴)

انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ دنیا کی رونقوں اور دنیا کے مسائل میں اتنا گم ہوتا ہے کہ اس سے اوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتا۔ حقیقت کو پانے کے لئے اپنے آپ کو ظاہر سے اوپر اٹھانا پڑتا ہے۔

بیشتر لوگ اپنے آپ کو ظاہر سے اوپر اٹھا نہیں پاتے اس لئے بیشتر لوگ حقیقت کو پانے والے بھی نہیں بنتے۔

29-105

اللہ میں جہاد

قرآن میں اہل ایمان کے بارہ میں ارشاد ہوا ہے: اور جن لوگوں نے ہمارے واسطے محنت کی، ان کو ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔ اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (العنکبوت ۶۹)

اس آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ نہیں ہے بلکہ جہاد فی اللہ کا لفظ ہے۔ یعنی اللہ میں جہاد کرنا، اللہ کے معاملہ میں اپنی محنت صرف کرنا۔ اس سے کیا مراد ہے۔ اس سے وہ کوشش مراد ہے جو اللہ کو پانے کے لئے کی جائے۔ جو تعلق باللہ بڑھانے کے لئے ہو۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ آدمی کے اندر خدا کا شعور زندہ ہو اور اس کو قرب الٰہی کے تجربات ہونے لگیں۔

اللہ پر ایمان کا مطلب صرف کلمہ پڑھ کر اقرار کرنا نہیں ہے۔ اس قسم کا ایمان صرف قانونی یا ظاہری ایمان ہے۔ اصل ایمان یہ ہے کہ آدمی اللہ کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر دریافت کرے۔ اس کا شعور اتنا زیادہ جاگ اٹھے کہ وہ کائنات کے مظاہر میں اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے لگے۔ اس کا ایمان جامد ایمان نہ ہو بلکہ ہر صبح و شام اس میں اضافہ ہوتا رہے۔ اس قسم کے زندہ ایمان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا وہ عمل ہے جس کو یہاں جہاد فی اللہ کہا گیا ہے۔

ناحق پرستی کے ماحول میں حق پرست بننا ایک شدید مجاہدہ کا عمل ہے۔ اس میں ملی ہوئی چیز چھنتی ہے۔ حاصل شدہ سکون درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مگر اس محرومی میں ایک عظیم یافت کا راز چھپا ہوا ہے۔ اور وہ معرفت اور بصیرت ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے انسانوں کے دروازے بند ہوتے ہیں مگر ان کے لئے خدا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ وہ دنیا سے کھو کر خدا سے پانے لگتے ہیں۔ وہ مادی راحتوں سے دور ہو کر ربانی کیفیات سے قریب ہو جاتے ہیں۔ ظاہری چیزیں ان سے اوجھل ہوتی ہیں مگر معنوی چیزیں ان پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ ان پر معرفت کے ایسے بھید کھلنے لگتے ہیں جن کی عام لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

30-106

خواہش پرستی

قرآن میں کائنات کی بہت سی نشانیوں (آیات) کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ نشانیاں ایسی ہیں کہ اگر ان پر غور کیا جائے تو ان میں آدمی خدا کے وجود کو دریافت کر لیتا ہے۔ آخرت پر اس کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی صداقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: بلکہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں نے بلا دلیل اپنے خیالات کی پیروی کر رکھی ہے۔ تو اس کو کون ہدایت دے سکتا ہے جس کو اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔ اور کوئی ان کا مددگار نہیں۔ (الروم ۲۹)

یہ آیت بتاتی ہے کہ حق کی بنیاد علم ہے اور ناحق کی بنیاد ہوا (خواہش)۔ موجودہ دنیا میں ہدایت کے اسباب اتنے زیادہ موجود ہیں کہ جو آدمی سنجیدہ اور واقعۃً حق کا طالب ہو وہ کبھی حق کو پانے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کی اپنی فطرت، اس کی خداداد عقل، کائنات میں بکھری ہوئی نشانیاں اور خدا کی کتاب، یہ سب چیزیں انسان کی صحیح رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ وہ اس بات کی ضمانت ہیں کہ آدمی بھٹکے بغیر حق کی منزل تک پہنچ سکے۔

ایسی حالت میں سچائی کو پانے میں وہی شخص ناکام رہے گا جو حقائق کو نظر انداز کر کے اپنی خواہش کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ آخرت کے بجائے دنیا کو ترجیح دے۔ وہ اصول کے بجائے مفاد پرستی کو اہم سمجھے۔ وہ حق کے اوپر اپنی مصلحتوں کو ترجیح دینے لگے۔ صرف ایسے ہی لوگ ہیں جو اس دنیا میں حق سے محروم رہیں گے۔

30-107

دین فطرت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: پس تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے۔ لیکن

اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر۔ اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ اور بہت سے گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے طریقہ پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔ (الروم ۳۰۔۳۲)

خدا کا دین عین وہی ہے جو انسان کی فطرت ہے۔ اور انسان کی فطرت عین وہی ہے جو خدا کا دین ہے۔ اس بنا پر انسان کے لئے نہ خدا کے دین کو پہچاننا مشکل ہے اور نہ اس پر قائم رہنا۔ اس کے باوجود انسان اگر گمراہ ہوتا ہے تو اس کے لئے وہ خود اپنے آپ ذمہ دار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل دین ایک ہے۔ اور وہ ہر پیغمبر پر اپنی کامل شکل میں اترا ہے۔ وہ ہے ایک اللہ کی طرف رجوع، ایک اللہ کا ڈر، ایک اللہ کی پرستاری، ہمہ تن ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو جانا، یہی دین فطرت ہے۔ یہ دین ابدی طور پر ہر انسان کی نفسیات میں سمویا ہوا ہے۔ تمام پیغمبروں نے اسی ایک دین کی تعلیم دی۔ مگر ان کے پیروؤں کی بعد کی نسلوں نے ایک دین کو کئی دین بنا ڈالا۔

کئی دین، ہمیشہ ان اضافی بحثوں سے بنتا ہے جو بعد کے لوگ پیغمبروں کی ابتدائی تعلیمات میں پیدا کرتے ہیں۔ عقائد میں نو ایجاد موشگافیاں، عبادات میں خود ساختہ مسائل کا اضافہ، زمانہ کے تاثر کے تحت دین کی نئی نئی تعبیریں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو بعد کے دور میں ایک دین کو کئی دین بنا دیتی ہیں۔ جب یہ اضافے وجود میں آتے ہیں تو لوگ اصل دین کے بجائے اپنے انہیں اضافوں پر سب سے زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ جن کی بدولت وہ دوسرے گروہ سے جدا ہو کر الگ گروہ بنے ہیں۔ ایک گروہ ایک قسم کے اضافہ پر زور دیتا ہے، اور دوسرا گروہ دوسرے قسم کے اضافہ پر۔ اس طرح بالآخر یہ نوبت آتی ہے کہ ایک دین کو ماننے والے عملاً کئی دینی گروہ میں بٹ کر رہ جاتے ہیں۔

30-108

دعوت اور صبر

قرآن میں دعوت اسلامی کے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے پیغمبر کو یہ نصیحت کی گئی ہے ـــــ

پس تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور تم کو بے برداشت نہ کردیں وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔ (الروم ٦٠)

دعوت حق کا کام ایک بے حد نازک کام ہے۔ داعی کی طرف سے حق کی پیغام رسانی کی حیثیت سادہ طور پر ایک اعلان کی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا عمل ہے جس کی بنیاد پر مدعو کے ابدی مستقبل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ دعوتی عمل کا یہ پہلو اس کو آخری حد تک ایک سنجیدہ عمل بنا دیتا ہے۔ اس مصلحت کی بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ دعوت کے عمل میں مدعو کی کامل رعایت کی جائے تاکہ جن لوگوں کے اندر قبولیت کا مادہ ہے وہ حق کو سمجھ کر اس کو قبول کرلیں اور جن کے اندر قبولیت کا مادہ نہیں ہے ان کے بارے میں پوری طرح یہ ثابت ہو جائے کہ ان کے اوپر سب کچھ واضح کیا جا چکا تھا، اس کے باوجود انھوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔

مدعو کی یہ رعایت داعی کے لئے دعوت کے عمل کو ایک انتہائی ذمہ دارانہ عمل بنا دیتی ہے۔ اس کو صبر کے انتہائی کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طاقت جواب دے رہی ہے اور اس نے اپنا حوصلہ کھو دیا ہے۔ مگر حق کے داعی کے لئے خدا کے یہاں جو عظیم انعام ہے اس کا مستحق وہ صرف اس وقت بنے گا جب کہ وہ صبر واستقامت کے ان مرحلوں میں ثابت قدم رہے گا۔

دعوت نہ صرف مدعو کے لئے بلکہ خود داعی کے لئے ایک سخت آزمائش ہے۔ ایسے وقت میں داعی کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے یقین کو نہ کھوئے۔ اگر حالات کی شدت کے تحت اس نے اپنے یقین کو کھو دیا تو وہ ایسی بات بولنے لگے گا جو عام لوگوں کو شاید اہم معلوم ہو مگر اللہ کی نظر میں اس سے زیادہ غیر اہم بات اور کوئی نہ ہوگی۔

31-109

نصیحت لقمان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کچھ نصیحتیں کیں۔ اس سلسلہ میں

انہوں نے کہا: اے میرے بیٹے نماز قائم کرو، اچھے کام کی نصیحت کرو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور لوگوں سے بے رخی نہ کر۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔ (لقمان ۱۷۔۱۹)

نماز قائم کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بااصول کردار کی ایک علامت اور ذمہ دارانہ زندگی گزارنے کا ایک مقدس عہد ہے۔ اور اس قسم کی زندگی پر وہی لوگ قائم رہ سکتے ہیں جو عزم اور حوصلہ کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے تیار ہوں۔

دین کے اوپر خود عمل کرنا یا دوسرے کو دین کی طرف بلانا، دونوں ہی صبر چاہتے ہیں۔ اس کے لئے کرنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے۔ نفس کی خواہش پر چلنے کے بجائے نفس کی خلاف چلنا پڑتا ہے۔ اپنی بڑائی کو محفوظ کرنے کے بجائے اپنی بڑائی کو کھو دینا پڑتا ہے۔ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا پڑتا ہے۔

یہ سب حوصلہ مندی کے کام ہیں، اور حوصلہ مندانہ کردار ہی کا دوسرا نام اسلامی کردار ہے۔ ایک مومن کو بیک وقت دو ذمہ داریوں کے درمیان جینا ہوتا ہے۔ ایک طرف خدا سے خوف و تعلق پر مبنی زندگی گزارنا اور دوسری طرف انسانوں کے درمیان اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کے درمیان رہنا۔

31-110

خدا رخی زندگی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور جو شخص اپنا رخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ نیک عمل والا بھی ہو تو اس نے مضبوط رسی پکڑ لی۔ اور اللہ ہی کی طرف ہے تمام معاملات کا انجام کار۔ اور جس نے انکار کیا تو اس کا انکار تم کو غمگین نہ کرے۔ ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی۔ تو ہم ان کو بتا دیں

گے جو کچھ انہوں نے کیا۔ بے شک اللہ دلوں کی بات سے بھی واقف ہے۔ ان کو ہم تھوڑی مدت فائدہ دیں گے۔ پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف کھینچ لائیں گے۔ (لقمان ۲۲۔۲۴)

ہر آدمی کا ایک رخ ہوتا ہے جدھر وہ اپنے پورے فکری اور عملی وجود کے ساتھ متوجہ رہتا ہے۔ مومن وہ ہے جس کا رخ پوری طرح خدا کی طرف ہو جائے۔ مومنانہ زندگی دوسرے لفظوں میں خدا رخی (God-oriented) زندگی کا نام ہے۔ اور غیر مومنانہ زندگی غیر خدا رخی زندگی کا نام۔

جس شخص نے خدا کی طرف رخ کیا اس نے صحیح منزل کی طرف رخ کیا۔ وہ یقیناً اچھے انجام کو پہنچے گا اس کے برعکس جو شخص خدا سے غافل ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جائے وہ بے رخ اور بے منزل ہو گیا۔ اس کو آج کی وقتی زندگی میں کچھ فائدے ہو سکتے ہیں مگر آخرت کی مستقل زندگی میں اس کے لئے عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔

32-111

جنت والوں کی صفات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہماری آیتوں پر وہی لوگ ایمان لاتے ہیں کہ جب ان کو ان کے ذریعہ یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈر سے اور امید سے۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ تو کسی کو خبر نہیں کہ ان لوگوں کے لئے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔ (السجدہ ۱۵۔۱۷)

ہدایت کے سلسلہ میں سب سے اہم چیز مادۂ اعتراف ہے۔ ہدایت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے اندر یہ مزاج ہو کر جب سچائی ان کے سامنے آئے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ سچائی بظاہر ایک چھوٹے آدمی کے ذریعہ سامنے آئی ہو، خواہ اس کو ماننا اپنے آپ کو غلط قرار دینے کے ہم

معنی ہو، خواہ اس کو مان کر اپنی زندگی کا نقشہ درہم برہم ہوتا ہوا نظر آئے۔ جن لوگوں کے اندر یہ حوصلہ ہو وہی سچائی کو پاتے ہیں۔ جو لوگ یہ چاہیں کہ وہ سچائی کو اس طرح مانیں کہ ان کی بڑائی بدستور قائم رہے ایسے لوگوں کو سچائی کبھی نہیں ملتی۔

جو آدمی حق کی خاطر اپنی بڑائی کو کھودے وہ سب سے بڑی چیز کو پالیتا ہے اور وہ خدا کی بڑائی ہے۔ اس کی زندگی میں خدا اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی یادوں کے ساتھ سوئے اور وہ اس کی یادوں کے ساتھ جاگے۔ اس کے خوف اور امید کے جذبات تمام تر خدا کے ساتھ وابستہ ہو جائیں۔ وہ اپنا اثاثہ اس طرح خدا کے حوالے کر دیتا ہے کہ اس میں سے کچھ بچا کر نہیں رکھتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں جنت کے ابدی باغوں میں ٹھنڈی ہوں گی۔

33-112

رسول کا نمونہ

رسول اور اصحاب رسول پر مختلف حالات گزرے۔ ہر صورت حال میں وہ حق پر پوری طرح قائم رہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کی یاد کرے۔ (الاحزاب ۲۱)

رسول اور اصحاب رسول کی زندگیاں قیامت تک کے اہل ایمان کے لئے خدا پرستانہ زندگی کا نمونہ ہیں، اس بات کا نمونہ کہ اللہ اور آخرت کی امیدواری کے معنی کیا ہیں۔ اللہ کو یاد کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اللہ کو یاد کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ مشکل حالات میں ثابت قدمی کسے کہتے ہیں۔ خدا کے وعدوں پر بھروسہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ اضافہ پذیر ایمان کیا ہے اور وہ کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔ خدا سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

رسول اور اصحاب رسول نے ان چیزوں کا آخری نمونہ قائم کر دیا۔ شدید ترین حالات میں بھی انہوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔ انہوں نے ہر معاملہ میں اسلامی فکر اور اسلامی کردار کا

کامل ثبوت دیا۔ امتحان کا لمحہ آنے سے پہلے بھی وہ حق پر قائم تھے اور امتحان کا لمحہ آنے کے بعد بھی وہ حق پر قائم رہے۔

پھر رسول اور اصحاب رسول کی زندگیاں ہی اس بات کا نمونہ بھی ہیں کہ خدا کے یہاں کسی کا فیصلہ امتحان کے بغیر نہیں کیا جاتا۔ خدا کا طریقہ یہ ہے کہ وہ شدید حالات پیدا کرتا ہے تاکہ سچے اہل ایمان اور جھوٹے دعویدار ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ اس خدائی قانون میں نہ پہلے کسی کا استثناء تھا اور نہ آئندہ کسی کا استثناء ہوگا۔

33-113

مومن اور مومنات

قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔ بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں۔ اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں۔ اور فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں۔ اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں۔ اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں۔ اور خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں۔ اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں ـــــ ان کے لئے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے (الاحزاب ۳۵)

قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرد اور ایک عورت کو جیسا دیکھنا چاہتا ہے وہ کیا ہے۔ وہ حسب ذیل دس صفات ہیں ـــــ اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، عفت، ذکر اللہ۔

ان دس الفاظ میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی کردار کے تمام پہلو سمٹ آئے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ کے یہاں مغفرت اور ایمان کا حق دار ہو اس کو ایسا بننا چاہئے کہ وہ

اللہ کے حکم کے آگے جھکنے والا ہو۔ وہ اللہ پر یقین کرنے والا ہو۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اللہ کے لئے یکسو ہو جائے۔ اس کی زندگی قول و فعل کے تضاد سے خالی ہو۔ وہ ہر حال میں جمار ہنے والا ہو۔ اللہ کی بڑائی کے احساس نے اسے متواضع بنادیا ہو۔ وہ دوسروں کی ضرورت پوری کرنے کو بھی اپنی ذمہ داری شمار کرتا ہو۔ وہ روزہ دار ہو جو نفس کو کنٹرول کرنے کی تربیت ہے۔ وہ شہوانی خواہشات کے مقابلہ میں عفیف اور پاک دامن ہو۔ اس کے صبح و شام اللہ کی یاد میں بسر ہونے لگیں۔

یہ اوصاف جس طرح مردوں سے مطلوب ہیں اسی طرح وہ عورتوں سے بھی مطلوب ہیں۔ ان اوصاف کے اظہار کا دائرہ بعض اعتبار سے دونوں کے درمیان مختلف ہے۔ مگر جہاں تک خود اوصاف کا تعلق ہے وہ دونوں کے لئے یکساں ہے۔ کوئی عورت ہو یا کوئی مرد وہ اسی وقت خدا کے یہاں قابل قبول ٹھہرے گا جب کہ وہ ان دس صفتوں سے متصف ہو کر خدا کے یہاں پہنچے۔

33-114

آخری رسول

قرآن میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ محمد ﷺ خدا کے آخری رسول ہیں۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوا ہے: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ (الاحزاب ۴۰)

خاتم النبیین کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ آپ نبیوں کی مہر ہیں۔ خاتم کا لفظ اسٹمپ (stamp) کے لئے نہیں آتا بلکہ سیل (seal) کے لئے آتا ہے۔ یعنی آخری عمل۔ لفافہ کو سیل کرنے کا مطلب اس کو آخری طور پر بند کرنا ہے کہ اس کے بعد نہ کوئی چیز اس کے اندر سے باہر نکلے اور نہ باہر سے اندر جائے۔ چنانچہ عربی میں قوم کا خاتم قوم کے آخری شخص کو کہا جاتا ہے۔ (خاتم القوم آخرھم)

قرآن میں یہ اعلان زید اور زینب کے قصے کے ذیل میں کیا گیا جس کی تفصیل تفسیر کی ہر کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مخصوص واقعہ کے ذیل میں آپ کے خاتم النبیین ہونے کے

اعلان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے بعد چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں، اس لئے ضروری ہے کہ تمام خدائی باتوں کا اظہار آپ کے ذریعہ سے کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے آخری رسول تھے، اس کے بارے میں قرآن کی یہ آیت ایک براہ راست بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بیان بالواسطہ انداز میں بھی موجود ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب ایک محفوظ کتاب ہے اس کی محفوظیت کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ قرآن کا یہ بیان بھی اس بات کا ایک بالواسطہ ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ کیوں کہ جب خدا کا ہدایت نامہ اپنی کامل اور محفوظ صورت میں دنیا میں موجود ہو تو ایسی حالت میں سنت اللہ کے مطابق کوئی نبی نہیں بھیجا جاتا۔

33-115

پیغمبر کا منصب

قرآن میں پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اے نبی، ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ۔ (الاحزاب ۴۵-۴۶)

شاہد، مبشر، نذیر، داعی یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو ہیں۔ پیغمبر کا مشن یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرے۔ وہ لوگوں کو جنت اور جہنم کی خبر دے، یہ ایک دعوتی عمل ہے اور اسی دعوتی عمل کی بنیاد پر پیغمبر آخرت کی عدالت میں ان لوگوں کے بارے میں گواہی دے گا جن پر اس نے امر حق پہنچایا اور پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہ مانا۔

چراغ کا کام یہ ہے کہ وہ اندھیرے میں چھپی ہوئی چیزوں کو نمایاں کر دے تاکہ جو چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی وہ دکھائی دینے لگے۔ یہی کام پیغمبر کی لائی ہوئی خدائی ہدایت کا ہے۔ لوگ افکار و روایات اور توہمات کے فکری جنگل میں گم ہیں۔ خدا کے رسول کی حیثیت اس فکری اندھیرے میں ایک روشن چراغ کی ہے، تاہم چراغ روشن ہونے کے باوجود وہی شخص چیزوں کو

ان کی صحیح صورت میں دیکھ سکے گا جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے اسی طرح پیغمبرانہ ہدایت کے باوجود اس سے رہنمائی صرف اس شخص کو ملے گی جو کھلے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہو۔ اس دنیا میں بند آنکھ کے لئے کوئی چیز دیکھنا مقدر نہیں۔ اسی طرح بند ذہن کے لئے بھی کسی حقیقت کو دریافت کرنا ممکن نہیں۔

33-116

قول سدید

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ وہ تمہارے اعمال سدھارے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ (الاحزاب ۷۱)

کلام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے سدید کلام، دوسرا ہے غیر سدید کلام۔ سدید کلام وہ ہے جو عین مطابق واقعہ ہو جو واقعاتی تجزیہ پر مبنی ہو۔ جو ٹھوس دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے، اس کے برعکس غیر سدید کلام وہ ہے جس میں حقیقت کی رعایت شامل نہ ہو۔ جس کی بنیاد ظن و گمان پر قائم ہو۔ جس کی حقیقت محض رائے زنی کی ہو نہ کہ حقیقت واقعہ کے اظہار کی۔ اول الذکر کلام مخلصانہ کلام ہے اور ثانی الذکر کلام غیر مخلصانہ کلام۔

درست کلام (قول سدید) کا نتیجہ ہمیشہ درست عمل ہوتا ہے۔ درست کلام کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی سوچ عین مطابقِ واقعہ ہے۔ اور جب سوچ مطابق واقعہ ہو تو عملی منصوبہ بندی بھی مطابق واقعہ ہو گی۔ مطابق واقعہ منصوبہ بندی لازماً معاملات کو درست کرتی ہے اور کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔

33-117

اختیاری عمل

ہم امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے

سے انکار کیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا۔ تاکہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے اور مومن مردوں اور مومن عورتوں پر توجہ فرمائے اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (الاحزاب ۷۲۔ ۷۳)

امانت سے مراد اختیار ہے۔ اختیار کو امانت اس لئے فرمایا کہ وہ اللہ کی ایک چیز ہے جس کو اس نے عارضی مدت کے لئے انسان کو بطور آزمائش دیا ہے تاکہ انسان خود اپنے ارادہ سے خدا کا تابعدار بنے۔ امانت، دوسرے لفظوں میں، اپنے اوپر خدا کا قائم مقام بننا ہے، اپنے آپ پر وہ کرنا ہے جو خدا ستاروں اور سیاروں پر براہ راست کر رہا ہے یعنی اپنے اختیار سے اپنے آپ کو خدا کے کنٹرول میں دے دینا۔

اس کائنات میں صرف اللہ حاکم ہے اور تمام چیزیں اس کی محکوم ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ وہ ایک ایسی آزاد مخلوق پیدا کرے جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے اختیار سے وہی کرے جو خدا اس سے کروانا چاہتا ہے۔ یہ اختیاری اطاعت بڑی نازک آزمائش تھی۔ آسمان اور زمین اور پہاڑ بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔ تاہم انسان نے شدید اندیشہ کے باوجود اس کو قبول کر لیا۔ اب انسان موجودہ دنیا میں خدا کی ایک امانت کا امین ہے۔ اس کو اپنے اوپر وہی کرنا ہے جو خدا دوسری چیزوں پر کر رہا ہے۔ انسان کو اپنے آپ پر خدا کا حکم چلانا ہے۔ انسان حالت امتحان میں ہے اور موجودہ دنیا اس کے لئے وسیع امتحان گاہ۔

یہ امانت ایک بے حد نازک ذمہ داری ہے، کیوں کہ اسی کی وجہ سے جزا و سزا کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری مخلوقات مجبور و مقہور ہیں، اس لئے ان کے واسطے جزا و سزا کا مسئلہ نہیں۔ انسان آزاد ہے۔ اس لئے وہ جزا و سزا کا مستحق بنتا ہے۔ جو مرد یا عورت موجودہ دنیا میں اپنی آزادی کا صحیح استعمال کریں، آزادی کے باوجود وہ خدا کے پابند بن کر رہیں، ان کے لئے آخرت کی ابدی جنتیں ہیں۔ اور جو لوگ آزادی پا کر سرکش ہو جائیں ان کے لئے آخرت کا ابدی عذاب۔

34-118

کائنات کی گواہی

تعریف خدا کے لئے ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اسی کی تعریف ہے آخرت میں اور وہ حکمت والا جاننے والا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ زمین کے اندر داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے اور وہ رحمت والا بخشنے والا ہے۔ (سبا ۱۔۲)

کائنات اپنے خالق کا تعارف ہے اس کی ہیبت ناک وسعت خالق کی عظمت کو بتاتی ہے اس کا حد کمال تک موزوں ہونا بتاتا ہے کہ اس کا پیدا کرنے والا ایک کامل و مکمل ہستی ہے، اس کے تمام اجزاء کا حد درجہ توافق کے ساتھ عمل کرنا ثابت کرتا ہے کہ اس کا چلانے والا انتہائی حد تک حکیم و علیم ہے۔ کائنات کا انسان کے لئے مکمل طور پر سازگار ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اس کا خالق اپنی مخلوقات کے لئے بے حد رحیم و کریم ہے۔

جو شخص کائنات پر غور کرے گا وہ خدا کے جلال و کمال کے احساس سے سرشار ہو جائے گا۔ وہ یقین کر لے گا کہ ازل سے ابد تک تمام عظمتیں صرف ایک خدا کے لئے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کے لئے نہیں۔ کائنات کے مختلف اجزاء میں ہم آہنگی اور کسی داخلی ٹکراؤ کے بغیر ان کا مسلسل چلتے رہنا اور ان کی سرگرمیوں کا ہمیشہ مفید نتیجہ پیدا کرنا، اس قسم کے واقعات خود اپنی ذات میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اسی کے ساتھ وہ علیم اور حکیم اور خبیر اور رحیم اور غفور ہے۔ کائنات اپنے خالق کے وجود کا بھی ثبوت ہے اور اسی کے ساتھ اس خالق کے صفات کمال کا تعارف بھی۔

34-119

کائناتی نشانیاں

اور جنہوں نے انکار کیا وہ کہتے ہیں، کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی بتائیں جو تم کو خبر دیتا ہے کہ

جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو پھر تم کو نئے سرے سے بنا ہے۔ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو کسی طرح کا جنون ہے۔ بلکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہی عذاب میں اور دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ تو کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی طرف نظر نہیں کی جو ان کے آگے ہیں اور ان کے پیچھے بھی۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑا گرادیں۔ بے شک اس میں نشانی ہے ہر اس بندے کے لئے جو متوجہ ہونے والا ہو۔ (سبا ۷۔۹)

اس دنیا میں سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ آدمی صحت فکر سے محروم ہو جائے۔ ایسا آدمی کسی چیز کو اس کے صحیح روپ میں نہیں دیکھ پاتا۔ کھلی ہوئی حقیقتوں سے بھی اس کو نصیحت حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اوپری فضا سے مسلسل بے شمار پتھر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ زمین کی طرف آتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پتھر انسانی بستیوں پر برسنے لگیں تو انسانی نسل کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی طرح زمین کے نیچے کا زیادہ حصہ گرم پگھلا ہوا لاوا ہے۔ اگر وہ غیر محدود طور پر پھٹ پڑے تو سطح زمین کی ہر چیز جل کر ختم ہو جائے۔ مگر خدا اپنے خصوصی انتظام کے تحت ایسا ہونے نہیں دیتا۔ آسمان اور زمین میں اس قسم کی واضح نشانیاں ہیں جو انسان کے عجز کو بتا رہی ہیں۔ مگر جب آدمی کے اندر صحیح سوچ نہ ہو تو کوئی نشانی اس کو ہدایت دینے والی نہیں بنتی۔ کھلی حقیقتوں کے درمیان وہ اس طرح رہتا ہے جیسے اسے کسی حقیقت کی خبر ہی نہیں۔

ہر انسان جو آج زندہ ہے وہ اس سے پہلے موجود نہ تھا۔ اس طرح انسان خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا عدم سے وجود میں آنا ممکن ہے۔ یہی واقعہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ موت کے بعد دوبارہ اس کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اگر عدم سے وجود سے پہلی بار وجود میں آنا ممکن تھا تو موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونا کیوں غیر ممکن ہو جائے گا۔

34-120

سفارش نہیں

کہو کہ ان کو پکارو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود سمجھ رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر

اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے۔ اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔ اور اس کے سامنے کوئی شفاعت کام نہیں آتی مگر اس کے لئے جس کے لئے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو گی تو وہ پوچھیں گے کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا۔ وہ کہیں گے کہ حق بات کا حکم فرمایا۔ اور وہ سب سے اوپر ہے، سب سے بڑا ہے۔ (سبا ۲۲۔۲۳)

لوگ اکثر خود ساختہ طور پر ایسے عقیدے بنا لیتے ہیں جو انہیں آخرت کی پکڑ سے بے خوف کر دیں۔ انہیں میں سے ایک یہ فرضی عقیدہ بھی ہے کہ بعض ہستیوں کو خدا کے یہاں اتنا بڑا مقام حاصل ہے کہ وہ اپنی سفارش سے جس کو چاہیں بخشوا سکتے ہیں۔

مگر اس قسم کا ہر عقیدہ نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ وہ خدا کی خدائی کا کمتر اندازہ ہے۔ جس آدمی کو خدا کی سچی معرفت حاصل ہو جائے وہ خدا کی عظمت کے احساس سے آخری حد تک دب جائے گا۔ ایسے شخص کے بارے میں یہ سمجھنا کتنا عجیب ہے کہ وہ خدا کے یہاں کسی کی نجات کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ اگر آخرت میں خدا کسی کو اس کی عزت افزائی کے لئے اسے بولنے کا موقع دے تب بھی وہ وہی بات کہے گا جو خدا کا فیصلہ ہے نہ کہ وہ اپنے طرف سے وہاں کسی بات کو منوانے کی کوشش کرے۔

34-121

نبوت محمدی

اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (سبا ۲۸)

ہر نبی نے براہ راست طور پر صرف اپنی قوم کے اوپر دعوتی کام کیا۔ اور یہی عملاً ممکن تھا۔ اسی طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہ راست طور پر اپنی ہی قوم کے لئے منذر و مبشر بنے۔ (الانعام ۹۲) مگر چونکہ آپ پر نبوت ختم ہو گئی اس لئے اب تمام قوموں کے لئے حکماً آپ

ہی منذر اور مبشر ہیں۔ اپنے زمانہ میں اپنے مخاطبین اول پر جس طرح آپ نے انذار و تبشیر کا کام کیا اسی طرح بعد کے زمانے میں دوسرے تمام مخاطبین پر آپ کی امت کو آپ کی نیابت میں انذار و تبشیر کا یہی کام کرنا ہے۔ یہ سارا کام آپ کی نبوت کے تسلسل میں شمار ہوگا۔ آپ کی زندگی میں کیا جانے والا دعوتی کام براہ راست طور پر آپ کے دائرہ بنوت میں داخل ہے اور آپ کی دنیوی زندگی کے بعد کیا جانے والا کام بالواسطہ طور پر۔

34-122

خوش حالی کا فتنہ

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم مال اور اولاد میں زیادہ ہیں اور ہم کبھی سزا پانے والے نہیں۔ کہو کہ میرا رب جس کو چاہتا ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کم کر دیتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور تمہارے مال اور تمہاری اولاد وہ چیز نہیں جو درجہ میں تم کو ہمارا مقرب بنادے۔ البتہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیا۔ ایسے لوگوں کے لئے ان کے عمل کا دونا بدلہ ہے اور وہ بالا خانوں میں اطمینان سے رہیں گے۔ اور جو لوگ ہماری آیتوں کو نیچا دکھانے کے لئے سرگرم ہیں وہ عذاب میں داخل کئے جائیں گے۔ (سبا ۳۴۔۳۸)

جن لوگوں کے پاس قوت اور مال آجائے ان کو موجودہ دنیا میں بڑائی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ چیز ان کے اندر فرضی اعتماد پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے لوگوں کو جب آخرت سے ڈرایا جاتا ہے تو وہ اس کو اہمیت نہیں دے پاتے۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ دنیا میں جب خدا نے ان کو عزت دی ہے تو آخرت میں وہ انہیں بے عزت کر دیگا۔

یہی فرضی اعتماد ہر دور کے بڑوں کے لئے دعوت حق کو نہ ماننے کا سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ اور وقت کے بڑے لوگ جب ایک چیز کو حقیر کر دیں تو چھوٹے لوگ بھی اس کو حقیر سمجھ لیتے ہیں، اس طرح خواص اور عوام دونوں حق کو قبول کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

دنیا کا مال و اسباب امتحان ہے نہ کہ انعام۔ دنیا کے مال و اسباب کی زیادتی نہ کسی آدمی کے مقرب ہونے کی علامت ہے اور نہ اس کی کمی اس کے غیر مقرب ہونے کی علامت۔ اللہ کے یہاں قربت کا مقام اس شخص کے لئے ہے جو اس بات کا ثبوت دے کہ جو کچھ اس کو دیا گیا تھا اس میں وہ خدا کی یادوں کے ساتھ جیا اور خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کا اپنے آپ کو پابند رکھا۔ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے ابدی انعام کے مستحق قرار دئے جائیں گے۔

35-123

توحید اور شرک

اے لوگو، اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے، جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کہاں دھوکا کھا رہے ہو (فاطر ۳)

انسان اپنی زندگی کے لئے بے شمار چیزوں کا محتاج ہے۔ مثلاً روشنی، پانی، ہوا، خوراک، معدنیات، وغیرہ۔ ان میں سے ہر چیز ایسی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لئے کائناتی طاقتوں کا متحدہ عمل درکار ہے۔ ایک خدا کے سوا کون ہے جو اتنے بڑے واقعہ کو ظہور میں لانے کی طاقت رکھتا ہو۔ مشرک اور ملحد لوگ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان اسباب حیات کی فراہمی ایک خدا کے سوا کوئی اور کر سکتا ہے۔ پھر جب ان تمام چیزوں کا خالق اور منتظم ایک خدا ہے تو اس کے سوا دوسروں کو معبود بنانا کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ توحید کی صداقت کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں شرک کا عقیدہ اس کائنات میں بالکل اجنبی ہے۔ توحید کی بنیاد دلائل پر ہے، اور شرک کی بنیاد صرف توہمات پر۔

35-124

تاریکی اور روشنی

اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں۔ اور نہ اندھیرا اور نہ اجالا۔ اور نہ سایہ اور نہ دھوپ۔

اور زندہ اور مردہ برابر نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ سناتا ہے جس کو وہ چاہتا ہے اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں میں ہیں۔ تم تو بس ایک خبردار کرنے والے ہو۔ (فاطر ۲۳)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو امید روشنی سے کی جاسکتی ہے وہ تاریکی سے نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح سایہ سے جو چیز ملے گی وہ دھوپ سے ملنے والی نہیں۔ یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسانوں میں کچھ آنکھ والے ہوتے ہیں اور کچھ اندھے ہوتے ہیں۔ آنکھ والا فوراً اپنے راستہ کو دیکھ کر اسے پہچان لیتا ہے۔ مگر جو اندھا ہو وہ صرف بھٹکتا پھرے گا۔ اس کو کبھی اپنے راستہ کی پہچان نہیں ہو سکتی۔

ایمان سے مراد معرفت ہے۔ خدا کا مطلوب ایمان وہ ہے جو کسی کو معرفت (ڈسکوری) کے طور پر ملے۔ امکانی طور پر اس معرفت کی استعداد ہر شخص کے اندر موجود ہے۔ مگر اس استعداد کا فائدہ صرف اس شخص کو ملتا ہے جو معرفت کی رکاوٹوں کو عبور کر کے منزل تک پہنچنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

35-125

علم سے خشیت

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دئے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ (فاطر ۲۷۔۲۸)

بادل سے ایک ہی پانی برستا ہے مگر اس سے مختلف قسم کی چیزیں اگتی ہیں۔ اچھے درخت بھی اور جھاڑ جھنکاڑ بھی۔ اسی طرح ایک ہی مادہ ہے جو پہاڑوں کی صورت میں منجمد ہوتا ہے مگر ان میں طرح طرح کے مختلف رنگ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح جاندار بھی سب ایک غذا کھاتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی انسان کے لئے کارآمد ہے اور کوئی بےکار۔

یہاں مختلف کائناتی نشانیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ: اللہ سے اس کے

بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ سیاق کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں خدا کی نشانیوں کا مطالعہ آدمی کے اندر اللہ کا خوف پیدا کرتا ہے۔ اس مطالعہ کے ذریعہ آدمی یہ دریافت کرتا ہے کہ خدا کتنا زیادہ عظیم اور قدیر ہے وہ مخلوقات میں خالق کا جلوہ دیکھنے لگتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو آدمی کائنات کا مطالعہ صحیح ذہن کے ساتھ کرے، اس کے لئے کائنات معرفت الٰہی کا آئینہ بن جائے گی۔

36-126

خلاء کی گواہی

اور ایک نشانی ان کے لئے رات ہے، ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں تو وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور سورج، وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ یہ عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دیں ہیں، یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔ (یٰس ۳۷۔۴۰)

زمین اور چاند اور سورج سب کا ایک مدار مقرر ہے۔ سب اپنے مختلف مدار پر حد درجہ صحت کے ساتھ گھوم رہے ہیں۔ اس گردش سے مختلف مظاہر وجود میں آتے ہیں۔ مثلاً زمین پر رات اور دن کا پیدا ہونا، چاند کا کم و بیش ہو کر فلکیاتی کیلنڈر کا کام کرنا، وغیرہ۔ یہ نظام کروڑوں سال سے قائم ہے اور پھر بھی اس میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔

یہ مشاہدہ خدا کی اتھاہ قدرت کا ایک تعارف ہے۔ اگر آدمی اسی سے سبق لے تو ایک خدا کی عظمت اس کے ذہن پر اس طرح چھائے کہ دوسری تمام عظمتیں اپنے آپ اس کے ذہن سے حذف ہو جائیں۔

کائنات ایک انتہائی وسیع خلاء ہے۔ اس کے اندر بے شمار ستارے اور سیارے ہیں، کہکشائیں اور شمسی نظام ہیں۔ یہ تمام اجرام مسلسل تیز رفتاری کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں۔ مگر

کھربوں سال گذرنے کے باوجود ان کے درمیان ٹکراؤ نہیں ہوتا ان میں سے ہر ایک اتنی زیادہ صحت کے ساتھ گردش کر رہا ہے کہ پیشگی طور پر اس کا ٹھیک تعین کیا جا سکتا ہے۔اس قسم کی نشانیاں واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ کائنات ایک عظیم ہستی کے کنٹرول میں ہے۔اس کے بغیر موجودہ کائنات کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

36-127

سفر کی سواریاں

اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔اور ہم نے ان کے لئے اسی کے مانند اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوئے ہیں۔اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں۔پھر نہ کوئی ان کی فریاد سننے والا ہو اور نہ وہ بچائے جا سکیں۔مگر یہ ہماری رحمت ہے اور ان کو ایک وقت معین تک فائدہ دینا ہے (یٰس ۴۱۔۴۴)

ہماری دینا میں خشکی بھی ہے اور سمندر بھی۔اور ہمارے اوپر وسیع فضا بھی۔خدا نے اس دنیا میں ایسے امکانات رکھ دئے ہیں کہ آدمی تینوں میں سے کسی حصہ میں بھی سفر سے عاجز نہ ہو۔وہ خشکی اور پانی اور فضا میں یکساں طور پر سفر کر سکے۔

یہ تمام سفر خدا کے قائم کردہ فطری نظام کے تحت ممکن ہوئے ہیں۔اگر خدا اپنے اس نظام کو واپس لے لے تو کوئی بھی سفر انسان کے لئے ممکن نہ رہے۔یہ انسان کے لئے اتنی بڑی رحمت ہے کہ انسان اگر اس پر غور کرے تو وہ خدا کے احسان سے اتنا زیادہ سرشار ہو کہ وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دے اور کبھی سرکشی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

36-128

جنت کی دنیا

بے شک جنت کے لوگ آج اپنے مشغلوں میں خوش ہوں گے۔وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں مسہریوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے۔ان کے لئے وہاں میوے ہوں گے اور ان

کے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا مہربان رب کی طرف سے۔
(یٰس ۵۴۔۵۸)

موجودہ دنیا میں آدمی کے عمل کے معنوی نتائج سامنے نہیں آتے۔ آخرت وہ جگہ ہے جہاں ہر آدمی اپنے عمل کے معنوی نتائج کو پائے گا۔ جو شخص یہاں صرف وقتی مفادات کے لئے سرگرم رہا وہ آخرت کی ابدی دنیا میں اس طرح اٹھے گا کہ وہاں بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ اس کے برعکس جو لوگ اعلیٰ مقصد کے لئے جئے وہ وہاں شاندار انجام میں خوش ہو رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات اس کے علاوہ ہوں گی۔

جنت لطیف ترین سرگرمیوں کی ایک دنیا ہے۔ وہاں دلچسپ ملاقاتیں ہوں گی۔ وہاں پر لطف مشاہدات ہوں گے۔ وہاں ایک دوسرے کے درمیان آفاقی سطح پر گفتگوئیں ہوں گی۔ ہر قسم کی محدودیت اور ہر قسم کی ناخوشگواری کا وہاں خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ انسان کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ اپنی پوری استعداد (capacity) کے ساتھ وہاں جی سکے۔

36-129

تسخیر کائنات

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لئے مویشی پیدا کئے۔ تو وہ ان کے مالک ہیں اور ہم نے ان کو ان کا تابع بنا دیا۔ تو ان میں سے کوئی ان کی سواری ہے اور کسی کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لئے ان میں فائدے ہیں اور پینے کی چیزیں بھی۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے (یٰس ۷۱۔۷۳)

مویشی جانور ایک قسم کی زندہ علامت ہیں جو بتاتے ہیں کہ مادی دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ انسان اس کو مسخر کر کے اس کو استعمال کر سکے۔ مادی دنیا کی اسی صلاحیت کے اوپر انسانی تہذیب کی پوری عمارت قائم ہے۔ اگر گھوڑے اور بیل میں بھی وہی وحشیانہ مزاج ہو جو ریچھ اور بھیڑیے میں ہوتا ہے۔ یا لوہا اور پٹرول اسی طرح انسان کے قابو سے باہر ہوں جس طرح زمین

کے اندر کا آتش فشاں مادہ انسان کے قابو سے باہر ہے تو تہذیب انسانی کا ارتقاء نا ممکن ہو جائے۔

اسی قانون فطرت کو قرآن میں تسخیر کہا گیا ہے۔ زمین اور زمین سے باہر کی تمام چیزیں اسی عمومی تسخیر کے تحت ہیں۔ کائنات میں اگر تسخیر کا یہ معاملہ نہ ہوتا تو انسان کے لئے اس دنیا میں نہ زندگی ممکن ہوتی اور نہ ترقی۔

37-130

موت کے بعد زندگی

قرآن میں مخالفین کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: پس ان سے پوچھو کہ ان کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا ان چیزوں کی جو ہم نے پیدا کی ہیں۔ ہم نے ان کو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ بلکہ تم تعجب کرتے ہو اور وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور جب ان کو سمجھایا جاتا ہے تو وہ سمجھتے نہیں۔ اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی میں ٹال دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے۔ اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی۔ کہو کہ ہاں، اور تم ذلیل بھی ہو گے۔ (الصافات ۱۱۔۱۸)

زمین و آسمان کی صورت میں جو کائنات ہمارے مشاہدے میں آتی ہے وہ اتنی پیچیدہ اور اتنی عظیم ہے کہ اس کے بعد انسان کو دوسری دنیا میں پیدا کرنا مقابلۃً ایک چھوٹا کام نظر آنے لگتا ہے۔ جس خالق کی قوت تخلیق کا عظیم تر نمونہ ہمارے سامنے موجود ہے اسی خالق سے اس سے چھوٹی تخلیق نا ممکن یا مستبعد کیوں۔

انسانی جسم کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام تر زمینی اجزاء کا ایک مجموعہ ہے۔ زمین میں پائے جانے والے مادے (پانی، کیلشیم، لوہا، سوڈیم، مگنسٹین، وغیرہ) کی ترکیب سے انسان بنا ہے۔ یہ تمام اجزاء ہماری دنیا میں افراط کے ساتھ پائے جاتے ہیں، پھر جن کائناتی اجزاء کی ترکیب سے خالق نے ایک بار انسان کو بنا کر کھڑا کر دیا، انہی کائناتی اجزاء کی ترکیب سے وہ دوبارہ کیوں ایسا نہیں کر سکتا۔

38-131

حاکم کے فرائض

حضرت داؤد پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کو خطاب کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا: اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے۔ تم لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرو وہ تجھ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ وہ روز حساب کو بھولے رہے۔ (ص ۲۶)

ایک حاکم ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ یا تو وہ معاملات کا فیصلہ اپنی چاہت کے مطابق کرے گا یا اصول حق کے مطابق۔ جو حاکم معاملات کا فیصلہ اپنی چاہ اور خواہش کے مطابق کرے وہ راہ سے بھٹک گیا۔ خدا کے یہاں اس کی سخت پکڑ ہوگی۔ اس کے برعکس جو حاکم معاملات کا فیصلہ حق وانصاف کے اصول کا پابند رہ کر کرے وہی راہ راست پر ہے۔ خدا کے یہاں اس کو بے حساب انعامات دئے جائیں گے۔

یہ ہدایات جس طرح ایک حاکم کے لئے ہے اسی طرح وہ عام انسانوں کے لئے بھی ہے۔ ہر انسان کے ساتھ اس کی خواہش لگی ہوئی ہے۔ ہر انسان کے لئے ہر معاملہ میں یہ سوال رہتا ہے کہ وہ اپنی خواہش پر چلے یا حق اور عدل کے اصول کے مطابق اپنی روش کا تعین کرے۔ ایک عام آدمی کی نجات بھی اسی طریقہ کو اختیار کرنے میں ہے جس میں ایک حکمراں کی نجات ہے۔ ہر آدمی کو اپنے دائرہ اختیار میں وہی کرنا ہے جو اس آیت میں با اقتدار حاکم کے لئے بتایا گیا ہے۔

38-132

کائنات کا سبق

اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو ان کے درمیان ہے عبث نہیں پیدا کیا، یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے انکار کیا، تو جن لوگوں نے انکار کیا ان کے لئے بربادی ہے آگ سے۔ کیا ہم

ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی مانند کر دیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں۔ یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں جیسا کر دیں گے۔ یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ (ص ۲۷۔۲۹)

دنیا کی چیزوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا پورا نظام نہایت حکیمانہ بنیادوں پر قائم ہے حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک اُلل ٹپ نظام ہو اور اس میں کوئی بات یقینی نہ ہو۔ دو امکان میں سے ایک مناسب تر امکان کا پایا جانا اس بات کا قرینہ ہے کہ اس دنیا کو پیدا کرنے والے نے اس کو ایک بامقصد منصوبہ کے تحت بنایا ہے۔ پھر جو دنیا اپنی ابتداء میں بامقصد ہو وہ اپنی انتہا میں بے مقصد کیوں کر ہو جائے گی۔

اسی طرح اس دنیا میں ہر آدمی آزاد اور خود مختار ہے۔ مشاہدہ دوبارہ بتاتا ہے کہ لوگوں میں کوئی شخص وہ ہے جو حقیقت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے اختیار سے اپنے آپ کو سچائی اور انصاف کا پابند بناتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص وہ ہے جو حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ بے قید ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جس طرح چاہے عمل کرتا ہے۔ عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی کہ جب یہاں دو قسم کے انسان ہیں تو ان کا انجام یکساں ہو کر رہ جائے۔

دنیا کی اس صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو زندگی کے متعلق قرآن کا بیان ہی زیادہ مطابق حقیقت نظر آئے گا نہ کہ ان لوگوں کا بیان جو زندگی کی تشریح اس کے برعکس انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کائناتی حقیقتوں کے بارے میں ایک خدائی بیان ہے، اور اس بیان کا عین مطابق واقعہ ہونا اس کے حق ہونے کا ایک لازمی ثبوت۔

38-133

جنت کی نعمتیں

یہ نصیحت ہے، اور بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے اچھا ٹھکانہ ہے، ہمیشہ کے باغ

جن کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوں گے۔ وہ ان میں تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ اور بہت سے میوے اور مشروبات طلب کرتے ہوں گے۔ اور ان کے پاس شرمیلی ہم سن بیویاں ہوں گی۔ یہ ہے وہ چیزیں جس کا تم سے روز حساب آنے پر وعدہ کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا رزق ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ (ص ۴۹۔ ۵۴)

آخرت میں جنت کے دروازے ان لوگوں کے لئے کھولے جائیں گے جو دنیا میں اپنے دل کے دروازے نصیحت کے لئے کھولے رکھیں۔ جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو اگلے دور حیات کی ابدی نعمتوں کے حصہ دار بنیں گے۔

قرآن میں آخرت کی جن نعمتوں کا ذکر ہے وہ سب بظاہر وہی ہیں جو دنیا میں بھی انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ مگر دونوں میں زبردست فرق ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں یہ نعمتیں اپنی وقتی اور ابتدائی شکل میں دی گئی ہیں اور آخرت میں یہ نعمتیں اپنی ابدی اور انتہائی شکل میں دی جائیں گی۔ مزید یہ کہ ان اعلیٰ نعمتوں کے ساتھ ہر قسم کے خوف اور اندیشہ کو حذف کر دیا جائے گا جن کا حذف ہونا موجودہ دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔

38-134

انسان اور شیطان

جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس کو درست کر لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس، کہ اس نے گھمنڈ کیا اور وہ انکار کرنے والوں میں ہو گیا۔ فرمایا کہ اے ابلیس، کس چیز نے تجھ کو روک دیا کہ تو اس کو سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ یہ تو نے تکبر کیا یا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے۔ فرمایا کہ تو یہاں سے نکل جا، کیوں کہ تو مردود ہے۔ اور تجھ پر میری لعنت ہے جزا کے دن تک۔ (ص ۷۱۔ ۷۸)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک انتہائی خصوصی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا اور اس کی علامت کے طور پر فرشتوں اور جنوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو سجدہ کریں۔ اس کے بعد جب ایسا ہوا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ نہیں کیا تو وہ ہمیشہ کے لئے ملعون قرار دیا گیا۔ مگر اس سنگین واقعہ کی اہمیت صرف ابلیس کے اعتبار سے نہ تھی بلکہ خود آدم کے لئے بھی اس کی بے حد اہمیت تھی۔

آدم کے آگے جھکنے سے انکار کر کے ابلیس ابدی طور پر نسل آدم کا حریف بن گیا۔ اس طرح انسانی تاریخ اول دن سے ایک نئے رخ پر چل پڑی۔ اس واقعہ نے طے کر دیا کہ انسان کے لئے زندگی کا سفر کوئی سادہ بات نہیں ہو گا بلکہ شدید مزاحمت کا سفر ہو گا۔ اس کو ابلیس کے بہکاؤں اور اس کی پر فریب تدبیروں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو صحیح راستہ پر قائم رکھنا ہو گا تاکہ وہ سلامتی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ سکے۔

انسان اور جنت کے درمیان شیطان کی فریب کاریاں حائل ہیں۔ جو شخص شیطان کی فریب کاریوں سے اپنے آپ کو بچائے وہی جنت کے ابدی باغوں میں داخل ہو گا۔ اور جو لوگ شیطان کی فریب کاریوں کا پردہ پھاڑنے میں ناکام رہیں وہی وہ لوگ ہیں جو جنت سے محروم رہ گئے۔

39-135

انسان کی گمراہی

اگر اللہ چاہتا کہ وہ بیٹا بنائے تو اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا چن لیتا، وہ پاک ہے۔ وہ اللہ ہے، اکیلا، سب پر غالب۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک ایک ٹھہری ہوئی مدت پر چلتا ہے۔ سن لو کہ وہ زبردست ہے، بخشنے والا (الزمر ۴-۵)

آدمی کے اندر فطری طور پر یہ جذبہ ہے کہ وہ خدا کی طرف لپکے۔ وہ خدا کی پرستش کرے۔ شیطان کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس جذبہ کو خدا کی طرف سے ہٹا کر دوسری طرف موڑ دے۔ اس کے لئے وہ لوگوں کے ذہن میں مختلف شبہات ڈالتا ہے۔ مثلاً یہ کہ خدا کی

بارگاہ اونچی ہے۔ تم براہ راست خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لئے کہ تم کو بزرگوں کے وسیلہ سے خدا تک پہنچنا چاہئے۔ اسی طرح وہ لوگوں کے ذہن میں یہ عقیدہ بٹھاتا ہے کہ جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے اسی طرح خدا کی بھی اولاد ہے۔ اور خدا کو خوش رکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم خدا کی اولاد کو خوش رکھو۔ جدید مادہ پرستی بھی اسی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس نے آدمی کے جذبۂ پرستش کو خالق سے ہٹا کر مخلوق کی طرف کر دیا ہے۔

اس قسم کی تمام باتیں خدا کی تصغیر ہیں۔ جو خدا شمسی نظام کو چلا رہا ہے اور جس نے عظیم کائنات کو سنبھال رکھا ہے وہ یقیناً اس سے بلند ہے کہ اس کے یہاں کسی کی سفارش چلے یا اس کے بیٹے بیٹیاں ہوں۔

39-136

تخلیقی نشانیاں

قرآن میں انسان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: اللہ نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر اس نے اس کا جوڑا بنایا۔ اور اسی نے تمہارے لئے نر و مادہ چوپایوں کی آٹھ قسمیں اتاریں۔ وہ تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں بناتا ہے۔ ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت، تین تاریکیوں کے اندر۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر تم کہاں سے پھیرے جاتے ہو۔ (الزمر ۶)

اس دنیا میں سب سے پہلے ایک انسان وجود میں آیا ہے۔ پھر عین اس کے مطابق اس کا ایک جوڑا نکالا گیا۔ اس طرح ابتدائی مرد و عورت کے ذریعہ انسانی نسل چلی۔ پھر انسان کی ضرورت کے لئے اس سے باہر اللہ تعالیٰ نے بے شمار چیزیں بنائیں۔ بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے (نر و مادہ کو ملا کر آٹھ قسمیں) یہی حیوانات تہذیب کے ابتدائی دور میں ہزاروں سال تک انسان کی معیشت کا ذریعہ بنے رہے۔ اس کے بعد جب تہذیب اگلے مرحلے میں پہنچی تو دوسری بے شمار چیزوں کو انسان نے استعمال کرنا شروع کیا جن کو خدا نے اول روز سے دنیا میں اس لئے دیا تھا کہ

انسان ان کو دریافت کرے اور انہیں اپنے کام میں لائے۔ جس طرح پالتو جانور طبیعی طور پر انسان کے لئے مسخر ہیں۔ اسی طرح گیس اور معدنیات بھی مسخر کی ہوئی ہیں، ورنہ انسان ان کو استعمال نہ کر سکے۔ مذکورہ آٹھ قسموں کی مثال بطور علامت ہے نہ کہ بطور حصر۔

انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں یہاں جن تین تاریکیوں کا ذکر ہے اس سے مراد تین پردے ہیں۔ اولاً پیٹ کی دیوار، پھر رحم مادر کا پردہ، اور پھر جنین کی بیرونی جھلی:

The mother's abdominal wall, the wall of the uterus, and the amniochorionic membrance.

یہ سارا انظام اتنا حیرتناک حد تک پیچیدہ اور عظیم ہے کہ خالق کائنات کے سوا کوئی اور ان کو ظہور میں نہیں لا سکتا۔ پھر اس کے سوا کون ہے جس کے سامنے انسان جھکے اور اس کی عبادت کرے۔

39-137

نفسیات کی گواہی

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے۔ اس کی طرف رجوع ہو کر۔ پھر جب وہ اس کو اپنے پاس سے نعمت دے دیتا ہے تو وہ اس چیز کو بھول جاتا ہے جس کے لئے وہ پکار رہا تھا اور وہ دوسروں کو اللہ کا برابر ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کردے۔ کہو کہ اپنے کفر سے تھوڑے دن فائدہ اٹھالے، بے شک تو آگ والوں میں سے ہے۔ بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں عاجزی کر رہا ہو، آخرت سے ڈرتا ہو اور اپنے رب کا امیدوار ہو، کہو، کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت تو وہی لوگ پکڑتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ (الزمر ۸-۹)

ہر آدمی پر ایسے لمحات آتے ہیں جب کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ جن چیزوں کو اپنا سہارا سمجھ رہا تھا وہ بھی اس نازک مرحلہ میں اس کے مددگار نہیں بنتے۔ اس وقت آدمی سب کچھ بھول کر خدا کو پکارنے لگتا ہے۔ اس طرح مصیبت کی گھڑیوں میں ہر آدمی جان لیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ مگر مصیبت دور ہوتے ہی وہ دوبارہ پہلے کی طرح بن جاتا ہے۔

انسان کی مزید سرکشی یہ ہے کہ وہ اپنی نجات کو خدا کے سوا دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرنے لگتا ہے۔ کچھ لوگ اس کو اسباب کا کرشمہ بتاتے ہیں اور کچھ لوگ فرضی معبودوں کا کرشمہ۔ آدمی اگر غلطی کر کے خاموش رہے تو یہ صرف ایک شخص کی گمراہی ہے۔ مگر جب وہ اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اس کی جھوٹی توجیہہ کرنے لگے تو وہ خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے والا بھی بنا۔

ایک انسان وہ ہے جس کو صرف مادی غم بے قرار کرے۔ دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا کی یاد بے قرار کر دیتی ہو، یہی دوسرا انسان دراصل خدا والا انسان ہے۔ اس کا اقرار خدا حالات کی پیداوار نہیں ہوتا، وہ اس کی شعوری دریافت ہوتا ہے۔ وہ خدا کو ایک ایسی برتر ہستی کی حیثیت سے پاتا ہے کہ اس کی امیدیں اور اس کے اندیشے سب ایک ایک خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس کی بے قراریاں رات کے لمحات میں بھی اس کو بستر سے جدا کر دیتی ہیں۔ اس کی تنہائی غفلت کی تنہائی نہیں ہوتی بلکہ خدا کی یاد کی تنہائی بن جاتی ہے۔

علم والا وہ ہے جس کی نفسیات میں خدا کی یاد سے ہلچل پیدا ہوتی ہو۔ اور بے علم والا وہ ہے جس کی نفسیات کو صرف مادی حالات بیدار کریں۔ وہ مادی جھٹکوں سے جاگے اور اس کے بعد دوبارہ غفلت کی نیند سو جائے۔

39-138

آزمائش کا پرچہ

اور جو لوگ شیطان سے بچے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور وہ اللہ کی طرف رجوع ہوئے۔ ان کے لئے خوش خبری ہے۔ تم میرے بندوں کو خوش خبری دے دو جو بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اس کے بہتر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی ہیں جو عقل والے ہیں (الزمر ۱۷۔۱۸)

موجودہ دنیا فتنہ کی دنیا ہے۔ یہاں حقیقتیں اپنی آخری بے نقاب شکل میں ظاہر نہیں ہوتی

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر بات کو غلط معنیٰ پہنایا جا سکتا ہے۔ شیطان اسی امکان کو استعمال کرکے لوگوں کو راہ راست سے بھٹکاتا ہے۔

جب بھی کوئی حق سامنے آتا ہے تو شیطان اس کو غلط معنیٰ پہنا کر لوگوں کے ذہن کو پھیرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ قول کے احسن پہلو سے ہٹا کر قول کے غیر احسن پہلو کو لوگوں کے سامنے لاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ آدمی کو اس عقل کا ثبوت دینا ہے کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرے۔ وہ شیطانی فریب کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھ سکے۔ جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دیں وہی وہ خوش قسمت لوگ ہیں جو خدائی سچائی کو پائیں گے اور جو لوگ اس بصیرت کا ثبوت دینے میں ناکام رہیں، ان کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں کہ وہ قول کے غیر احسن پہلوؤں میں الجھے رہیں اور خدا کے یہاں شیطان کے پرستار کی حیثیت سے اٹھائے جائیں۔

39-139

خوش خبری

قرآن میں پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: کہو کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بے شک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ۔ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے۔ پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی۔ (الزمر ۵۳۔۵۴)

جن لوگوں کے سینے میں حساس دل ہے ان کو جب خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو ان کو یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ اب تک ان سے جو گناہ ہوئے ہیں ان کا معاملہ کیا ہوگا۔ اسی طرح خدا پرستانہ زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی آدمی سے بار بار کوتاہیاں ہوتی ہیں اور اس کی حساسیت دوبارہ اس کو ستانے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ احساس بعض لوگوں کو مایوسی کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

ایسے لوگوں کے لئے اللہ نے اپنی کتاب میں یہ اعلان فرمایا کہ انہیں یقین کرنا چاہئے کہ ان

کا معاملہ ایک ایسے خدا سے ہے جو غفور و رحیم ہے۔ وہ آدمی کے ماضی کو نہیں بلکہ اس کے حال کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے باطن کو دیکھتا ہے۔ وہ آدمی سے وسعت کا معاملہ فرماتا ہے نہ کہ خوردہ گیری کا۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ از سر نو اس کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے لیتا ہے۔ خواہ اس سے کتنا ہی بڑا قصور کیوں نہ ہو گیا ہو۔

یہ ایک عظیم خوش خبری ہے۔ یہ انسان کو ناامیدی کے غار سے نکال کر امید کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ خدا کو ایک پر ہیبت آقا کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ ایک ایسے شفیق خدا کی نظر سے دیکھے جس نے یہ لکھ دیا ہے کہ اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب رہے گی۔ یہ اعلان آدمی کے لئے خدا کو اس کے شوق و محبت کے جذبات کا مرکز بنا دیتا ہے۔

39-140

عبادت الٰہی

اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔ آسمان اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ کہو کہ اے نادانو، کیا تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کے لئے کہتے ہو۔ اور تم سے پہلے والوں کی طرف بھی وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا۔ اور تم خسارہ میں رہو گے۔ بلکہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور شکر کرنے والوں میں سے بنو۔ (الزمر ۶۲-۶۶)

کائنات کی موجودگی اس کے خالق کی موجودگی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح کائنات جتنے بامعنی اور جس قدر منظم طور پر چل رہی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر آن ایک نگرانی کرنے والا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ آدمی اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ کائنات میں اس کے خالق کی نشانی پا لے گا اور اسی طرح اس کے ناظم اور مدبر کی نشانی بھی۔

ایسی حالت میں جو لوگ ایک خدا کے سوا دوسری ہستیوں کے عبادت گزار بنتے ہیں وہ ایک ایسا عمل کر رہے ہیں جس کی موجودہ کائنات میں کوئی قیمت نہیں۔ کیوں کہ خالق اور وکیل

جب صرف ایک ہے تو اسی کی عبادت آدمی کو نفع دے سکتی ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا گویا ایسے معبود کو پکارنا ہے جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔

39-141

عظمت الٰہی

اور لوگوں نے اللہ کی قدر نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ اور زمین ساری اس کی مٹھی میں ہو گی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں۔ وہ پاک اور برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ مگر جس کو اللہ چاہے۔ پھر دوبارہ اس میں پھونکا جائے گا تو یکایک سب کے سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی۔ اور کتاب رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے۔ اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور وہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں (الزمر ۶۷۔۷۰)

اکثر گمراہیوں کی جڑ خدا کا کمتر اندازہ ہے۔ آدمی دوسری عظمتوں میں اس لئے گم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی اتھاہ عظمت کا پتہ نہیں۔ وہ اپنے اکابر سے وابستگی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے تو اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو معلوم نہیں کہ خدا اس سے زیادہ بڑا ہے کہ وہاں کوئی شخص اپنی زبان کھولنے کی جرأت کر سکے۔ قیامت جب لوگوں کی آنکھ کا پردہ ہٹائے گی تو ان کو معلوم ہو گا کہ خدا تو اتنا عظیم تھا جیسے کہ زمین ایک چھوٹے سکہ کی طرح اس کی مٹھی میں ہو اور آسمان ایک معمولی کاغذ کی طرح اس کے ہاتھ میں لپٹا ہوا ہو۔

جس طرح امتحان ہال میں امتحان کے ختم ہونے پر الارم بجتا ہے اسی طرح موجودہ دنیا کی مدت ختم ہونے پر صور پھونکا جائے گا۔ اس کے بعد سارا نظام بدل جائے گا۔ اس کے بعد ایک نئی دنیا بنے گی۔ ہماری موجودہ دنیا سورج کی روشنی سے روشن ہوتی ہے۔ جو صرف محسوس مادی اشیاء

کو ہمیں دکھائی پاتی ہے۔ آخرت کی دنیا براہ راست خدا کے نور سے روشن ہوگی۔ اس لئے وہاں یہ ممکن ہوگا کہ معنوی حقیقتوں کو بھی کھلی آنکھ سے دیکھا جاسکے۔ اس وقت تمام لوگ خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ دنیا میں لوگوں نے پیغمبروں کو اور ان کی تبعیت میں اٹھنے والے داعیوں کو نظر انداز کیا تھا۔ مگر آخرت میں لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ لوگوں کے مستقبل کا فیصلہ وہاں اسی بنیاد پر کیا جارہا ہے کہ کس نے ان کا ساتھ دیا اور کس نے ان کا انکار کردیا۔

40-142

خدا اور انسان

اور ان کو قریب آنے والی مصیبت کے دن سے ڈراؤ جب کہ دل حلق تک آپہنچیں گے، وہ غم سے بھرے ہوئے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات مانی جائے۔ وہ نگاہوں کی چوری کو جانتا ہے اور ان باتوں کو بھی جن کو سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا۔ اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بے شک اللہ سننے والا ہے، دیکھنے والا ہے (المومن ۱۸۔۲۰)

موجودہ دنیا میں انسان کو ہر طرح کے مواقع حاصل ہیں۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس سے آدمی غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے۔ وہ اپنی موجودہ عارضی حالت کو مستقل حالت سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ یہ مواقع جو انسان کو ملے ہیں وہ بطور امتحان ہیں نہ کہ بطور استحقاق۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی موجودہ تمام مواقع اس سے چھن جائیں گے۔ اس وقت انسان کو معلوم ہوگا کہ اس کے پاس عجز کے سوا اور کچھ نہیں جس کے سہارے وہ کھڑا ہو سکے۔

آدمی چاہتا ہے کہ بے قید زندگی گزارے۔ اسی مزاج کی وجہ سے آدمی غیر خدا کو بطور خود خدائی میں شریک بناتا ہے۔ تاکہ اس کے نام پر وہ اپنی بے راہ روی کو جائز ثابت کر سکے۔ مگر قیامت میں جب حقیقت بے پردہ ہو کر سامنے آئے گی تو آدمی جان لے گا کہ یہاں خدا کے سوا کوئی نہ تھا جس کو کسی قسم کا اختیار حاصل ہو۔

40-143

تاریخ کی گواہی

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ ان سے بہت زیادہ تھے قوت میں اور ان آثار کے اعتبار سے بھی جو انہوں نے زمین میں چھوڑے۔ پھر اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا۔ اور کوئی ان کو اللہ سے بچانے والا نہ تھا۔ یہ اس لئے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی نسانیاں لے کر آئے تو انہوں نے انکار کیا۔ تو اللہ نے ان کو پکڑ لیا۔ یقیناً وہ طاقت ور ہے سخت سزا دینے والا ہے۔ (المومن ۲۱۔ ۲۲)

دنیا کی تاریخ میں کثرت سے ایسے واقعات ہیں کہ ایک قوم ابھری اور پھر مٹ گئی۔ ایک قوم جس نے زمین پر شاندار تمدن کھڑا کیا آج اس کا تمدن کھنڈر کی صورت میں زمین کے نیچے دبا ہوا پڑا ہے۔ ایک قوم جس کو کسی وقت ایک زندہ واقعہ کی حیثیت حاصل تھی، آج وہ صرف ایک تاریخی واقعہ کے طور پر قابل ذکر سمجھی جاتی ہے۔

اس قسم کے واقعات لوگوں کے لئے معلوم واقعات ہیں۔ مگر لوگوں نے ان واقعات کو ارضی حوادث یا سیاسی انقلابات کے خانہ میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ سب خدائی فیصلے تھے جو سچائی کے انکار کے نتیجے میں ان قوموں پر نازل ہوئے۔ اگر ہم کو وہ نگاہ حاصل ہو جس سے ہم معنوی حقیقتوں کو دیکھ سکیں تو ہم کو نظر آئے گا کہ ہر واقعہ خدا کے فرشتوں کے ذریعہ انجام پا رہا تھا، اگرچہ بظاہر دیکھنے والوں کو وہ دنیوی اسباب کے تحت ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

41-144

کائنات کا جواب

کہو کیا تم لوگ اس ہستی کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں بنایا۔ اور تم اس کے ہمسر ٹھہراتے ہو۔ وہ رب ہے تمام جہان والوں کا اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں۔ اور اس میں اس کی غذائیں ٹھہرا دیں چار دن میں۔ پورا ہوا پوچھنے

والوں کے لئے۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا پھر اس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں آؤ خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پھر اس نے دو دن میں اس کے سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کا حکم بھیج دیا۔ اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی۔ اور اس کو محفوظ کر دیا۔ یہ عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے۔ (حم السجدہ ۹۔۱۲)

کائنات کا علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ اس کی تخلیق کئی دوروں میں تدریجی طور پر ہوئی ہے۔ تدریجی تخلیق دوسرے لفظوں میں منصوبہ بند تخلیق ہے۔ اور جب کائنات کی تخلیق منصوبہ بند انداز میں ہوئی ہے تو یقینی ہے کہ اس کا ایک منصوبہ ساز ہو جس نے اپنے مقرر منصوبہ کے تحت اس کو ارادۃً بنایا ہو۔

اسی طرح یہاں زمین کے اوپر جگہ جگہ پہاڑ ہیں جو زمین کے توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس دنیا میں کروڑوں قسم کے ذی حیات ہیں۔ ہر ایک کو الگ رزق درکار ہے۔ مگر ہر ایک کا رزق اس طرح کامل نظم کے ساتھ موجود ہے کہ جس کو جو روزی درکار ہے وہ اپنے قریب ہی اس کو پالیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تمام چیزیں ابتداءً منتشر ایٹم کی صورت میں تھیں۔ پھر وہ مجتمع ہو کر الگ الگ اشیاء کی صورت میں متشکل ہوئیں۔ اسی طرح کائنات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وسیع کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی قانون فطرت میں نہایت محکم طور پر جکڑی ہوئی ہیں۔

یہ مشاہدات واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا خالق علیم و خبیر ہے۔ وہ قوت اور غلبہ والا ہے۔ پھر دوسرا کون ہے جس کو انسان اپنا معبود قرار دے۔

41-145

کھال کی گواہی

اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف جمع کئے جائیں گے، پھر وہ جدا جدا کئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آجائیں گے۔ ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کی کھال ان پر ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی

دی۔ وہ کہیں گی کہ ہم کو اسی اللہ نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اور اسی نے تم کو پہلی مرتبہ پیدا کیا اور اسی کے پاس تم لائے گئے ہو۔ اور تم اپنے کو اس سے چھپا نہ سکتے تھے کہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف گواہی دیں۔ (حم السجدہ ۱۹۔۲۲)

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی کھال اور اس کے اعضاء اس کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ موجودہ زمانہ میں نطقِ جلد ی(skin speech) کے سائنسی نظریہ نے اس کو واقعاتی طور پر ثابت کر دیا ہے۔ اب خود انسانی علم کے تحت معلوم ہو گیا ہے کہ آدمی کا ہر بول اس کے جسم کی کھال پر مرتسم ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کو دوبارہ اسی طرح سنا جا سکتا ہے جس طرح مشینی طور پر ریکارڈ کی ہوئی آواز کو دوبارہ سنا جاتا ہے۔

خدا چونکہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا اس لئے انسان سمجھتا ہے کہ خدا اس کو دیکھتا نہیں ہے۔ یہی غلط فہمی آدمی کے اندر سرکشی پیدا کرتی ہے۔ اگر آدمی جان لے کہ خدا ہر لحہ اس کو دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا رویہ بالکل بدل جائے۔

41-146

خدا کا حق

اور اس کی نشانیوں میں سے ہیں رات اور دن اور سورج اور چاند۔ تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر تم اسی کی عبادت کرنے والے ہو۔ پس اگر وہ تکبر کریں تو جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں وہ شب و روز اسی کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے۔ (حم السجدہ ۳۷۔۳۸)

انسان کی سب سے بڑی گمراہی اس کی ظاہر پرستی ہے۔ قدیم زمانہ کے انسان کو سورج اور چاند اور ستارے سب سے زیادہ نمایاں نظر آئے۔ اس لئے اس نے ان مظاہر کو خدا سمجھ لیا اور ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ موجودہ زمانہ میں مادی تہذیب کی جگمگاہٹ لوگوں کو نمایاں دکھائی دے رہی ہے اس لئے اب مادی تہذیب کو وہ مقام دے دیا گیا ہے جو قدیم زمانہ میں سورج اور چاند کو حاصل

تھا۔ حالانکہ خواہ سورج اور چاند ہوں یا دوسرے مظاہر، سب کے سب خدا کی مخلوق ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ خالق کا پرستار بنے نہ کہ اس کی مخلوق کا۔

تکبر کرنے والوں کا تکبر دعوت کے مقابلہ میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمیشہ داعی کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ وقت کے بڑوں کو بظاہر داعی اپنے سے چھوٹا نظر آتا ہے اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھ لیتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی طرف سے پیش کئے جانے والے پیغام کو بھی۔

41-147

بارش کی مثال

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تم زمین کو فرسودہ حالت میں دیکھتے ہو پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھول جاتی ہے۔ بے شک جس نے اس کو زندہ کر دیا وہ مردوں کو بھی زندہ کر دینے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو لوگ ہماری آیتوں کو الٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ کیا جو آگ میں ڈالا جائے گا وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے دن امن کے ساتھ آئے گا جو کچھ چاہے کر لو۔ بے شک وہ دیکھتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ (حم السجدہ ۳۹۔۴۰)

سوکھی زمین میں بارش کا برسنا اور اس سے سبزہ کا اگنا ایک ایسا مظہر ہے جو ہر آدمی کے سامنے بار بار آتا ہے۔ یہ ایک معنوی حقیقت کی مادی تمثیل ہے۔ اس طرح انسان کو بتایا جاتا ہے کہ خدا نے یہاں اس کے خشک وجود کو سرسبز و شاداب کرنے کا وسیع انتظام کر رکھا ہے۔ زمین کی مٹی پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ بارش اس کو سرسبز و شاداب کرنے کا ذریعہ بنے۔ اسی طرح انسان اگر خدا کی ہدایت کو اپنے اندر اترنے دے تو اس کا وجود بھی ہدایت پا کر لہلہا اٹھے گا۔

خدا کی ہدایت سے فیض یاب نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان خدا کی باتوں میں الحاد (انحراف) کرتا ہے۔ خدا کی رہنمائی اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کو سیدھے

مفہوم میں نہیں لیتا، بلکہ اس میں ٹیڑھ نکال کر اس کو منحرف کر دیتا ہے۔ اس طرح خدا کی رہنمائی اس کے ذہن کا جزء نہیں بنتی۔ وہ اس کی روح کو غذا دینے والی ثابت نہیں ہوتی۔

خدا کی رہنمائی کو سیدھی طرح قبول کرنے والوں کے لئے جنت کا انعام ہے اور خدا کی رہنمائی میں ٹیڑھا مفہوم نکالنے والوں کے لئے جہنم کا عذاب۔

41-148

آفاق وانفس کی گواہی

ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے۔ اور کیا یہ بات کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا گواہ ہے۔ سن لو، یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات میں شک رکھتے ہیں۔ سن لو، وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ (حم السجدہ ۵۳۔ ۵۴)

دنیا میں جتنے انسان بڑے بڑے دعووں کے ساتھ اٹھے ہیں، ان سب کی کہانی حال کی کہانی ہے، کسی کی کہانی بھی مستقبل کی کہانی نہیں۔ کسی کا مستقبل بھی اس کے حال کی تصدیق کرنے والا نہ بن سکا۔ ایسی دنیا میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ پیشین گوئی کی گئی کہ قرآن کے بعد ظاہر ہونے والے واقعات وحقائق قرآن کی تصدیق کرتے چلے جائیں گے۔ قرآن آئندہ آنے والے تمام زمانوں میں اپنی صداقت کو نہ صرف باقی رکھے گا بلکہ مزید واضح اور مدلل کرتا چلا جائے گا۔ قرآن ہمیشہ وقت کی کتاب رہے گا۔

یہ بات حیرت انگیز طور پر صد فی صد درست ثابت ہوئی ہے، علمی تحقیقات، تاریخی واقعات، زمانی انقلابات، سب قرآن کے حق میں جمع ہوتے چلے گئے۔ حتی کہ آج غیر مسلم محققین بھی گواہی دے رہے ہیں کہ قرآن اپنی نادر خصوصیات کی بنا پر خود اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ کسی انسانی تصنیف میں ایسی ابدی خصوصیات پائی نہیں جا سکتیں۔

اس کھلی ہوئی حقیقت کے باوجود جو لوگ قرآن کی صداقت کے آگے نہ جھکیں وہ صرف یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی بے خوفی کی نفسیات نے ان کو غیر سنجیدہ بنا دیا ہے۔ کیونکہ غیر سنجیدہ

انسان ہی سے اس قسم کی غیر معقول روش ظاہر ہو سکتی ہے کہ وہ کھلے کھلے شواہد کو دیکھے اور اس کے باوجود اس کا اقرار نہ کرے۔

42-149

بعثت محمدی

اور ہم نے اسی طرح تمہاری طرف عربی قرآن اتارا ہے تاکہ تم مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو ڈراؤ اور ان کو جمع ہونے کے دن سے ڈراؤ جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ آگ میں (الشوریٰ ۷)

پیغمبر کی دعوت کا اصل نشانہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے کہ آخر کار وہ خدا کے سامنے حاضر کئے جانے والے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کے عمل کے مطابق کسی کے لئے ابدی جنت کا فیصلہ ہوگا اور کسی کے لئے ابدی جہنم کا۔

رسول اللہ ﷺ اسی حقیقت سے آگاہ کرنے کے لئے آئے۔ آپ کی بعثت کے دو دور ہیں ایک براہ راست، دوسرا، بالواسطہ۔ آپ کی براہ راست بعثت مکہ اور اطراف مکہ کے لئے تھی۔ اس کی تکمیل آپ نے خود اپنی زندگی میں فرما دی۔ آپ کی بالواسطہ بعثت بواسطۂ امت تمام عالم کے لئے ہے۔ آپ کی یہ دوسری بعثت جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے اہل عرب کے سامنے عربی زبان میں اپنا پیغام پہنچایا۔ آپ کے بعد آپ کی امت کو بھی آپ کی نیابت میں اسی اصول پر اپنا دعوتی فریضہ انجام دینا ہے۔ اس کو ہر قوم کے سامنے اس کی اپنی زبان میں حق کا پیغام پہنچانا ہے۔ جب تک کسی قوم کو اس کی اپنی زبان میں پیغام نہ پہنچایا جائے اس پر پیغام رسانی کا حق ادا نہ ہوگا۔

42-150

خدا کی عدالت

اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں

داخل کرتا ہے اور ظالموں کا کوئی حامی ومددگار نہیں۔ کیا انہوں نے اس کی سوا دوسرے کارساز بنا رکھے ہیں۔ پس اللہ ہی کارساز ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور جس کسی بات میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی کے سپرد ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ (الشوریٰ ۸۔۱۰)

انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک غیر معمولی رحمت کا دروازہ کھولا ہے جو کسی اور کے لئے نہیں کھولا۔ وہ ہے خود اپنے ارادہ سے اللہ کی ہدایت کو اختیار کرنا۔ اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے غیر معمولی انعام کا مستحق بننا۔ لوگوں کا مختلف راستے اختیار کرنا اسی آزادی کی قیمت ہے۔ یہ اختلاف یقیناً ایک ناپسندیدہ چیز ہے مگر اس قیمتی انسان کو چننے کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں۔

خدا نے اگرچہ انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ مگر اس کی ہدایت کے لئے انسان کے اندر اور اس کے باہر اتنا زیادہ سامان رکھا گیا ہے کہ اگر آدمی واقعۃً سنجیدہ ہو تو وہ کبھی غلط راستہ اختیار نہ کرے۔ ایسی حالت میں جو لوگ غلط راستہ اختیار کریں وہ بہت بڑے ظالم ہیں۔ وہ خدا کے یہاں ہرگز معافی کے قابل نہ ٹھہریں گے۔

اہل حق اور اہل باطل کے درمیان دنیا میں جو اختلاف پیدا ہوتا ہے اس کا آخری فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کا حال یہ ہے کہ یہاں ہر آدمی اپنے موافق الفاظ پالیتا ہے، یہاں یہ ممکن ہے کہ جھوٹ کو بھی سچ کے روپ میں ظاہر کیا جا سکے۔ مگر یہ صرف موجودہ زندگی کے مرحلہ تک ہے، جہاں انسان کا مقابلہ انسان سے ہے۔ اگلی زندگی میں انسان کا مقابلہ خدا سے ہوگا۔ وہاں کسی کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ اپنے آپ کو پرفریب الفاظ کے پردہ میں چھپا سکے۔

42-151

دنیا اور آخرت

اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔ اور وہ قوت والا، زبردست ہے۔ جو شخص آخرت کی کھیتی چاہے ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔ اور جو

شخص دنیا کی کھیتی چاہے ہم اس کو اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (الشوریٰ ۱۹۔۲۰)

دنیا کی زندگی امتحان کے لئے ہے۔ یہاں ہر آدمی کو بقدر امتحان ضروری اسباب دیئے جاتے ہیں۔ اب جو شخص آخرت پسند ہو وہ موجودہ دنیا کے اسباب کو آخرت کی تعمیر کے لئے استعمال کرے گا اور اس کے نتیجہ میں آخرت میں مزید اضافہ کے ساتھ اپنا انعام پائے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا پسند ہو وہ صرف موجودہ دنیا کے پیش نظر عمل کرے گا۔ ایسا شخص موجودہ دنیا میں اپنی محنتوں کا پھل پا سکتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ سراسر محروم رہے گا۔ جب اس نے آخرت کے لئے کچھ کیا ہی نہ تھا تو کیسے ممکن ہے کہ آخرت میں اس کو کچھ دیا جائے۔

42-152

ایمان کی صفات

اور وہ لوگ جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں اور جنہوں نے اپنے رب کی دعوت کو قبول کیا اور نماز قائم کیا اور وہ اپنا کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی۔ پھر جس نے معاف کر دیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں کے اوپر کچھ الزام نہیں۔ الزام صرف ان پر ہے جو لوگوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔ (الشوریٰ ۳۷۔۴۳)

ایمان جب حقیقی معنوں میں کسی کو حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کے اندر انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے۔ یہاں بندۂ خدا کی جن خصوصیات کا ذکر

ہے وہ سب وہی ہیں جو اس ایمانی شخصیت کے نتیجے میں کسی کے اندر ظاہر ہوتی ہیں۔

ایسے شخص کے اندر حقیقت واقعہ کے اعتراف کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے خدا ہونے اور اپنے بندہ ہونے کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے آگے جھک جاتا ہے۔ خدا کی ایک پکار بلند ہو تو اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اس پر لبیک نہ کہے۔ ایمانی شعور اس کو صحیح اور غلط کے بارہ میں حساس بنا دیتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو کرنا چاہئے اور وہ نہیں کرتا جو نہیں کرنا چاہئے۔

اپنی حیثیت واقعی کا اعتراف اس کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے جو اس سے غصہ، ظلم اور سرکشی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ یہی تواضع اس کو مجبور کرتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں وہ دوسروں کے مشورہ سے فائدہ اٹھائے وہ محض اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر اقدام سے پرہیز کرے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا رشتہ خیر خواہی کا ہوتا ہے۔ نہ کہ ضد اور استحصال کا۔

ایسا آدمی دوسروں کے خلاف کبھی جارحیت نہیں کرتا۔ دوسروں کے خلاف وہ جب بھی اقدام کرتا ہے تو دفاع کے طور پر کرتا ہے اور اتنا ہی کرتا ہے جتنا ان کے ظلم کو روکنے کے لئے ضروری ہو۔ وہ عین اشتعال انگیز حالات میں بھی اس کے لئے تیار رہتا ہے کہ لوگوں کو معاف کر دے اور انہوں نے اس کے ساتھ جو برائی کی ہے اس کو بھول جائے۔

بندۂ مومن یہ سارے کام اپنے جذبۂ ایمان کے تحت کرتا ہے تاہم اللہ اس کی قدر دانی اس طرح فرماتا ہے کہ اس کو اہل ہمت اور الوالعزم کے خطاب سے نوازتا ہے۔ اور اس کو ابدی نعمتوں کے باغ میں داخل کر دیتا ہے۔

43-153

پیغمبروں کی تاریخ

کیا ہم تمہاری نصیحت سے اس لئے صرف نظر کر لیں گے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو اور ہم نے اگلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔ اور ان لوگوں کے پاس کوئی نبی نہیں آیا جس کا انہوں

نے مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر جو لوگ ان سے زیادہ طاقت ور تھے ان کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور اگلے لوگوں کی مثالیں گذر چکیں (الزخرف ۵۔۸)

آج دنیا میں بے شمار ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو پچھلے پیغمبروں کا نام عزت کے ساتھ لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ان پیغمبروں کا (بشمول پیغمبر اسلام) ان کے ہم زمانہ لوگوں نے مذاق کیوں اڑایا۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پچھلے لوگ وحشی تھے اور آج کے لوگ مہذب ہیں۔ یہ صرف زمانہ کا فرق ہے۔ آج لمبی مدت گزرنے کے بعد ہر پیغمبر کے ساتھ تاریخی عظمت کا زور شامل ہو چکا ہے۔ اس لئے آج ہر ظاہر بیں پیغمبر کو پہچان لیتا ہے۔ مگر پیغمبر اپنی زندگی میں اس پر عظمت تاریخ کے بغیر تھا، اس لئے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو صرف ایک عام انسان نظر آتا تھا۔ اس وقت پیغمبر کی پیغمبرانہ حیثیت کو پہچاننے کے لئے حقیقت بیں نگاہ درکار تھی۔ اور بلاشبہ حقیقت بیں نگاہ دنیا میں ہمیشہ سب سے کم پائی گئی ہے۔

دعوت حق کے مخاطبین خواہ کتنا ہی زیادہ غلط رویہ اختیار کریں، داعی یک طرفہ طور پر صبر کرتے ہوئے اپنے دعوتی عمل کو جاری رکھتا ہے۔ تا آنکہ وہ وقت آجائے جب کہ خدا اپنی طرف سے دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ فرمادے۔

43-154

پیغمبر کا مقصد

اور جب عیسیٰ کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تم پر واضح کر دوں بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ تو تم اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ پھر گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا۔ پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا، ایک دردناک دن کے عذاب سے۔ (الزخرف ۶۳۔۶۵)

یہاں حکمت سے مراد دین کی روح ہے اور صراط مستقیم سے مراد وہی چیز ہے جس کو آیت میں خدا کا خوف، اس کی عبادت اور رسول کی اطاعت کہا گیا ہے۔ یہی اصل دین ہے۔ یہود نے بعد کو یہ کیا کہ انہوں نے روح دین کھودی اور دین کے بنیادی احکام میں موشگافیوں کے ذریعہ بے شمار نئے نئے مسائل پیدا کئے۔ یہ مسائل آج بھی یہود کی کتابوں میں موجود ہیں۔ انہیں خود ساختہ اضافوں کی وجہ سے ان کے اندر اختلافی فرقے بنے۔ کسی نے ایک اختلافی مسئلہ پر زور دیا، کسی نے دوسرے اختلافی مسئلہ پر۔ اس طرح ان کے یہاں ایک دین کئی دین بن گیا۔ حضرت مسیح اس لئے آئے کہ وہ یہود کو بتائیں کہ دین میں اصل اہمیت روح کی ہے نہ کہ ظواہر کی۔ اور یہ کہ آدمی کو نجات جس چیز پر ملے گی وہ اس دین کی پیروی پر ملے گی جو خدا نے بھیجا ہے نہ کہ اس دین پر جو تم لوگوں نے بطور خود وضع کر رکھا ہے۔

حضرت مسیح نے بتایا کہ اصل دین یہ ہے کہ تم اللہ سے ڈرو۔ صرف ایک اللہ کے عبادت گزار بنو۔ زندگی کے معاملات میں پیغمبر کے نمونہ کی پیروی کرو۔ اس کے سوا تم نے اپنی بحثوں اور موشگافیوں سے جو بے شمار مسائل بنا رکھے ہیں وہ تمہارے اپنے اضافے ہیں۔ ان اضافوں کو چھوڑ کر اصل دین پر قائم ہو جاؤ۔ حضرت مسیح کی یہ باتیں آج بھی کسی نہ کسی صورت میں انجیلوں میں موجود ہیں۔

43-155

شفاعت کا تصور

اور اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے، مگر وہ جو حق کی گواہی دیں گے اور وہ جانتے ہوں گے۔ اور اگر ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر وہ کہاں بھٹک جاتے ہیں۔ اور اس کے رسول کے اس کہنے کی خبر ہے کہ اے میرے رب، یہ ایسے لوگ ہیں کہ ایمان نہیں لاتے۔ پس ان سے درگزر کرو اور کہو کہ سلام ہے تم کو، عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا۔ (الزخرف ۸۶۔۸۹)

قیامت میں پیغمبر اور داعیان حق جو شفاعت کریں گے وہ حقیقۃً شفاعت نہیں ہے بلکہ

شہادت ہے۔ یعنی ایسی بات کی گواہی دینا جس کو آدمی ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ آخرت میں جب لوگوں کا مقدمہ پیش ہوگا تو سارے علم کے باوجود اللہ مزید تائید کے طور پر ان لوگوں کو کھڑا کرے گا جو قوموں کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے ان کے سامنے حق کا پیغام پیش کیا۔ پھر کسی نے مانا اور کسی نے نہیں مانا۔ کسی نے حق کا ساتھ دیا اور کوئی حق کا مخالف بن کر کھڑا ہو گیا۔ یہی تجربہ جو ان صالحین پر براہ راست گزرا اس کو وہ خدا کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے کہ کوئی گواہ عدالت میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر ایک سچا بیان دے۔ اس کے سوا کسی کو قیامت میں یہ اختیار حاصل نہ ہوگا کہ وہ کسی مجرم کا شافع بن کر کھڑا ہو اور اس کے بارے میں اس خدائی فیصلہ کو بدل دے جو از روئے واقعہ اس کے بارے میں ہونے والا تھا۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے حضور کوئی شخص ایسا کرنے کی کوشش کرے۔

دعوت حق کا کام سراسر نصیحت کا کام ہے۔ آخری مرحلہ میں جب کہ داعی پر یہ واضح ہو جائے کہ لوگ کسی طرح ماننے والے نہیں ہیں، اس وقت بھی داعی لوگوں کے لئے خدا سے دعا کرتا ہے۔ لوگوں کی ایذاءرسانی پر صبر کرتے ہوئے وہ لوگوں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے۔

44-156

کائنات کی معنویت

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے حق کے ساتھ بنایا ہے۔ لیکن ان کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ بے شک فیصلہ کا دن ان سب کا طے شدہ وقت ہے۔ جس دن کوئی رشتہ دار کسی رشتہ دار کے کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی کچھ حمایت کی جائے گی۔ ہاں مگر وہ جس پر اللہ رحم فرمائے بے شک وہ زبردست ہے، رحمت والا ہے۔ (الدخان ۳۸۔۴۲)

زمین و آسمان کے نظام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق نہایت بامعنی انداز میں ہوئی ہے۔ پوری کائنات ایک مقصد کے تحت عمل کرتی ہے۔ کائنات کے نظام میں اگر

یہ معنویت نہ ہو تو اس دنیا میں انسان کے لئے شاندار تمدن کی تعمیر ناممکن ہو جائے۔

آخرت کا عقیدہ کائناتی معنویت کی توسیع ہے۔ جو کائنات اتنے بامعنی انداز میں بنائی گئی ہو، ناممکن ہے کہ وہ سراسر بے معنی طور پر ختم ہو جائے۔ کائنات کی موجودہ معنویت اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ ایک بامعنی اور بامقصد انجام پر ختم ہونے والی ہے۔ آخرت اسی بامعنی اور بامقصد انجام کا دوسرا نام ہے۔

دنیا کا موجودہ مرحلہ آزمائش کا مرحلہ ہے۔ اس لئے آج دنیا کی معنویت میں ہر آدمی اپنا حصہ پا رہا ہے۔ مگر جب آخرت آئے گی تو اس وقت کی معنویت میں صرف ان لوگوں کو حصہ ملے گا جو خدا کے نزدیک فی الواقع اس کے مستحق قرار پائیں۔

44-157

جنت کی دنیا

بے شک خدا سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں۔ باریک ریشم اور دبیز ریشم کے لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ بات اسی طرح ہے، اور ہم ان سے بیاہ دیں گے حوریں بڑی بڑی آنکھ والی۔ وہ اس میں طلب کریں گے ہر قسم کے میوے نہایت اطمینان سے۔ وہ وہاں موت کو نہ چکھیں گے مگر وہ موت جو پہلے آچکی ہے اور اللہ نے ان کو جہنم کے عذاب سے بچالیا۔ یہ تیرے رب کے فضل سے ہوگا، یہی ہے بڑی کامیابی (الدخان ۵۱۔۵۷)

ان الفاظ میں انسان کی پسند کی اس دنیا کی تصویر ہے جو اس کے خوابوں میں بسی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اپنی پسند کی اس دنیا کو پانا چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں وہ اس کو حاصل نہیں کر پاتا۔ یہ خوابوں کی دنیا مزید اضافہ کے ساتھ اس کو جنت میں حاصل ہو جائے گی۔

ہر قسم کے ڈر سے خالی یہ دنیا ان لوگوں کو ملے گی جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے رہے۔ ابدی نعمتوں سے بھری ہوئی یہ زندگی ان کا حصہ ہوگی جنہوں نے اس کی خاطر دنیا کی وقتی نعمتوں کو

قربان کیا تھا۔ آخرت کی اس عظیم کامیابی میں وہ لوگ داخل ہوں گے جنھوں نے اس کو پانے کے لئے اپنی دنیا کی کامیابی کو خطرہ میں ڈالنے کا حوصلہ کیا تھا۔

45-158

قرآن کا دعویٰ

یہ نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ اللہ غالب، حکمت والے کی طرف سے۔ بے شک آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں ایمان والوں کے لئے۔ اور تمہارے بنانے میں اور ان حیوانات میں جو اس نے زمین میں پھیلا رکھے ہیں۔ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس سے زمین کو زندہ کر دیا اس کے مر جانے کے بعد، اور ہواؤں کی گردش میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم حق کے ساتھ تمہیں سنا رہے ہیں۔ پھر اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ (الجاثیہ ۱۔۶)

قرآن کا یہ کہنا کہ یہ کتاب عزیز و حکیم خدا کی طرف سے اتری ہے، گویا خود اپنی طرف سے ایک ایسا قطعی معیار دینا ہے جس پر قرآن کی صداقت کو جانچا جا سکے۔ خدائے عزیز کی طرف سے اس کے اترنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اس کتاب کو زیر نہ کر سکے گا۔ قرآن ہر حال میں اپنے مخالفین پر غالب آ کر رہے گا۔

یہ بات مکی دور میں کہی گئی تھی۔ اس وقت حالات سر اسر قرآن کے خلاف تھے۔ مگر بعد کی تاریخ نے حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق کی۔ قرآن کی دعوت کو تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔

اسی طرح خدائے حکیم کی طرف سے اترنے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے مضامین سب کے سب عقل و دانش پر مبنی ہوں۔ یہ بات بھی تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے مسلسل درست ثابت ہوتی جا رہی ہے، قرآن دور سائنس سے پہلے اترا۔ مگر دور سائنس میں بھی قرآن کی کوئی بات عقل کے

خلاف ثابت نہ ہو سکی۔

اس کے علاوہ جو کائنات انسان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اس کی تمام چیزیں قرآن کے پیغام کی تصدیق بن گئی ہیں۔ تاہم یہ تصدیق صرف ان لوگوں کے لئے تصدیق بنے گی جن کے اندر یقین کرنے کا ذہن ہو، جو نشانیوں کی زبان میں ظاہر کی جانے والی بات کو پانے کی استعداد رکھتے ہوں۔

45-159

حق کو نظر انداز کرنا

خرابی ہے ہر شخص کے لئے جو جھوٹا ہو۔ جو خدا کی آیتوں کو سنتا ہے جب کہ وہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں پھر وہ تکبُر کے ساتھ اڑا رہتا ہے، گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں۔ پس تم اس کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی چیز کی خبر پاتا ہے تو وہ اس کو مذاق بنالیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔ ان کے آگے جہنم ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے کچھ کام آنے والا نہیں۔ اور نہ وہ جن کو انہوں نے اللہ کے سوا کارساز بنایا۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ یہ ہدایت ہے، اور جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا ان کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہے۔ (الجاثیہ ۷۔۱۱)

حق کا اعتراف اکثر حالات میں اپنی بڑائی کو کھونے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ آدمی اپنی بڑائی کو کھونا نہیں چاہتا۔ اس لئے وہ حق کا اعتراف بھی نہیں کرتا۔ مگر حق کے آگے نہ جھکنا خدا کے آگے نہ جھکنا ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے خدا کے یہاں سخت ترین عذاب ہے۔

آدمی اگرچہ تکبر کی بنا پر حق سے اعراض کرتا ہے تاہم اپنے رویہ کے جواز کے لئے وہ نظریاتی دلیل پیش کرتا ہے۔ مگر اس دلیل کی حقیقت جھوٹی لفظی توجیہہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسا آدمی کسی چیز کو غلط مفہوم دے کر اس کو شوشہ بناتا ہے۔ وہ اس شوشہ کی بنیاد پر حق کا اور اس کے داعی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ ایسے لوگ سخت ترین عذاب کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنی بد

عملی پر سرکشی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اس سرکشی پر انہیں جو چیز آمادہ کرتی ہے وہ ان کی دنیوی حیثیت ہے۔ مگر کسی کی دنیوی حیثیت آخرت میں اس کے کچھ کام آنے والی نہیں۔

45-160

تسخیر کائنات

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اور اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، سب کو اپنی طرف سے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں (الجاثیہ ۱۲۔ ۱۳)

پانی بظاہر ڈبانے والی چیز ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے قوانین کا پابند بنایا ہے کہ اتھاہ سمندروں کے اوپر بڑے بڑے جہاز ایک طرف سے دوسری طرف چلتے ہیں اور بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہی معاملہ پوری کائنات کا ہے۔ کائنات اسی طرح بنائی گئی ہے کہ وہ پوری طرح انسان کے تابع ہے۔ انسان جس طرح چاہے اس کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ موجودہ دنیا کی یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہ ممکن ہوا ہے کہ یہاں انسان اپنے لئے شاندار تمدن کی تعمیر کر سکے۔

کائنات کا موجودہ ڈھانچہ ہی اس کا آخری اور واحد ڈھانچہ ہے۔ وہ دوسرے بے شمار طریقوں سے بھی بن سکتی تھی۔ مگر مختلف امکانات میں سے وہی ایک امکان واقعہ بنا جو ہمارے لئے مفید تھا۔ یہ ایک نشانی ہے جس میں غور کرنے والے غور کریں تو وہ اس میں اپنے لئے عظیم الشان سبق پا سکتے ہیں۔

45-161

بامعنی انجام

کیا وہ لوگ جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں

کی مانند کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا۔ ان سب کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے۔ بہت برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کوئی ظلم نہ ہو گا۔ (الجاثیہ ۲۱۔۲۲)

جو شخص یہ خیال کرے کہ آدمی اچھا بن کر رہے یا برا بن کر، سب برابر ہے۔ آخر کار دونوں ہی کو مر کر مٹ جانا ہے، ایسا آدمی نہایت بے بنیاد خیال اپنے دماغ میں قائم کرتا ہے۔ ایسا سمجھنا اس شعور عدل کے خلاف ہے جو ہر آدمی کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہے۔ نیز یہ کائنات کی اس معنویت کا انکار کرتا ہے جو اس کے نظام کے اندر کمال درجہ میں پائی جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اندرونی فطرت اور اس کے باہر کی وسیع کائنات دونوں اس کو سراسر باطل ثابت کرتے ہیں کہ زندگی کو ایک ایسی بے مقصد چیز سمجھ لیا جائے جس کا کوئی انجام سامنے آنے والا نہیں۔

45-162

مجرمانہ ذہن

پس جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو ان کا رب ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہی کھلی کامیابی ہے۔ اور جنہوں نے انکار کیا، کیا تم کو میری آیتیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔ پس تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔ اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، اور ہم اس پر یقین کرنے والے نہیں۔ (الجاثیہ ۳۰۔۳۲)

تکبر سے مراد خدا کے مقابلہ میں تکبر نہیں ہے بلکہ خدا کے داعی کے مقابلہ میں تکبر ہے۔ خدا کی بات کو ماننا موجودہ دنیا میں بظاہر خدا کے داعی کی بات کو ماننے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اب جو لوگ تکبر میں مبتلا ہوں وہ اس کو اپنے مرتبہ سے کم تر سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی بات مان لیں۔ چنانچہ وہ اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تکبر کی نفسیات

سے خالی ہوں وہ فوراً اس کے آگے جھک جاتے ہیں۔ پہلے گروہ کے لئے خدا کا غضب ہے اور دوسرے گروہ کے لئے خدا کی رحمت۔

ایک انسان جب حق کا انکار کرتا ہے تو اپنے انکار کو جائز ثابت کرنے کے لئے وہ طرح طرح کی باتیں کرتا ہے۔ وہ کبھی داعی کو نا قابل اعتماد ثابت کرتا ہے۔ کبھی داعی کے پیغام میں شک وشبہہ کا پہلو نکالتا ہے۔ مگر قیامت کے دن کھل جائے گا کہ یہ سب مجرمانہ ذہن سے نکلی ہوئی باتیں تھیں نہ کہ حق پرستانہ ذہن سے نکلی ہوئی باتیں۔

46-163

علم کی دو قسمیں

کہو کہ کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے زمین میں کیا بنایا ہے۔ یا ان کا آسمان میں کچھ ساجھا ہے۔ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔ اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت تک اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہیں۔ اور جب لوگ اکٹھا کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور وہ ان کی عبادت کے منکر بن جائیں گے۔ (الاحقاف ۴۔۶)

علم حقیقۃً صرف دو ہے۔ ایک الہامی علم (revealed knowledge)۔ یعنی وہ علم جو پیغمبروں کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچا۔ دوسرا ثابت شدہ علم (established knowledge) یعنی وہ علم جس کا علم ہوتا انسانی تحقیقات اور تجربات سے ثابت ہو گیا ہو ان کو دوسرے لفظوں میں، نقلی علم اور عقلی علم کہہ سکتے ہیں۔

ان دونوں میں سے کوئی بھی علم یہ نہیں بتاتا کہ اس کائنات میں ایک خدا کے سوا کوئی اور ہستی ہے جو خدائی کے لائق ہے۔ اور جب علم کے دو ذریعوں میں سے کوئی ذریعہ شرک کی گواہی نہ دے تو مشرکانہ عقیدہ انسان کے لئے کیوں کر درست ہو سکتا ہے۔ جو شخص خدا کو چھوڑ کر کسی

اور چیز کو اپنا سہارا بنائے وہ سہارا آخرت کے دن اس سے برأت کرے گا نہ کہ وہ اس کا مددگار بنے۔

46-164

آسمانی کتابیں

اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب تھی رہنما اور رحمت۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو اس کو سچا کرتی ہے۔ عربی زبان میں، تاکہ وہ ان لوگوں کو ڈرائے جنھوں نے ظلم کیا۔ اور وہ خوش خبری ہے نیک لوگوں کے لئے۔ بے شک جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہی لوگ جنت والے ہیں: جو اس میں ہمیشہ رہیں گے، ان اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے تھے (الاحقاف ۱۲۔ ۱۴)

قرآن میں اور دوسری آسمانی کتابوں میں ایک فرق یہ ہے کہ پچھلی آسمانی کتابیں اپنے بعد ایک اور کتاب کی اور اسی طرح ایک اور نبی کے آنے کی خبر دیتی ہیں جب کہ قرآن صاف طور پر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ آخری آسمانی کتاب ہے، پیغمبر اسلام کے بعد کوئی اور پیغمبر آنے والا نہیں۔ اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ قرآن کے بعد کوئی اور کتاب آسمان سے نازل ہو۔

یہ فرق اپنے آپ ثابت کرتا ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں کی حیثیت انسان کے لئے آخری ہدایت نامہ کی نہیں۔ یہ کتابیں صرف پچھلے قافلۂ انسانی کے لئے تھیں۔ قرآن کے نزول کے بعد ان کا دور ہدایت ختم ہو گیا۔ اب انسان جس دور ہدایت میں ہے اس میں انسان کے لئے صرف ایک ہی کتاب ہدایت الٰہی کا ماخذ ہے۔ یہ کتاب قرآن ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن پچھلی آسمانی کتابوں کے لئے ناسخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ان کے دور کو منسوخ کر دینے والا۔

46-165

فطرت کا نظام

اور ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس کی ماں نے تکلیف کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا۔ اور تکلیف کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کا دودھ چھڑانا

تیس مہینے میں ہوا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو وہ کہنے لگا کہ اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور میری اولاد میں بھی مجھ کو نیک اولاد دے۔ میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے اچھے اعمال کو ہم قبول کریں گے اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے۔ وہ اہل جنت میں سے ہوں گے۔ سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا۔ (الاحقاف ۱۵۔۱۶)

انسانی نسل کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایک ماں اور ایک باپ کے ذریعہ وجود میں آتا ہے جو اس کی پرورش کر کے اس کو بڑا بناتے ہیں۔ یہ گویا انسان کی تربیت کا فطری نظام ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان کے اندر حقوق اور فرائض کا شعور پیدا ہو۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو کہ اسے اپنے محسن کا احسان ماننا ہے اور اس کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ جذبہ بیک وقت انسان کو دوسرے انسانوں کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ خالق و مالک خدا کے عظیم تر حقوق کو ادا کرنے کی تعلیم بھی۔

جو لوگ فطرت کے معلم سے سبق لیں جو لوگ اپنے شعور کو اس طرح بیدار کریں کہ وہ اپنے والدین سے لے کر اپنے خدا تک ہر ایک کے حقوق کو پہچانیں اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کی ابدی رحمتوں کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔

46-166

طیبات دنیا، طیبات آخرت

اور ہر ایک کے لئے ان کے اعمال کے اعتبار سے درجے ہوں گے۔ اور تاکہ اللہ سب کو ان کے اعمال پورے کردے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ اور جس دن انکار کرنے والے آگ کے سامنے لائے جائیں گے۔ تم اپنی اچھی چیزیں دنیا کی زندگی میں لے چکے اور ان کو برت چکے تو آج تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی، اس وجہ سے کہ تم دنیا میں ناحق تکبر کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ تم

نافرمانی کرتے تھے (الاحقاف ۱۹۔۲۰)

ایک شخص کے سامنے حق آتا ہے اور وہ دنیوی مصلحت اور مادی مفاد کی خاطر اس کو اختیار نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اہمیت دی۔ اس نے طیبات آخرت کے مقابلہ میں طیبات دنیا کو اپنے لئے پسند کر لیا۔

اسی طرح اپنی بڑائی کا احساس آدمی کے لئے بے حد لذیذ چیز ہے۔ جب ایسا ہو کہ اپنی بڑائی کا گھروندا توڑ کر حق کو قبول کرنا ہو اور آدمی اپنی بڑائی کو بچانے کے لئے حق کو قبول نہ کرے، اس وقت بھی گویا اس نے طیبات دنیا کو ترجیح دی اور طیبات آخرت کو نا قابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے دنیا کی طیبات کی خاطر آخرت کی طیبات کو نظر انداز کیا وہ آخرت میں ذلت کے عذاب سے دوچار ہوں گے۔ جس کا عمل جس درجہ کا ہوگا اسی کے بقدر وہ اپنے عمل کا انجام آخرت میں پائے گا۔

قرآن کی اس آیت میں "طیبات" سے مراد دولت اور اقتدار سے لے کر شہرت اور مقبولیت تک تمام وہ چیزیں ہیں جن کو انسان پسند کرتا ہے۔ اس طرح اس کا تعلق انسان کے ہر قول و عمل سے ہو جاتا ہے۔ جب بھی انسان کے سامنے ایک صورت حال ہو مگر اس میں وہ خدا کی پسندیدہ روش کو اس لئے اختیار نہ کرے کہ ایسا کرنے سے اس کا دنیا کا مفاد یا اس کی دنیوی مصلحتیں مجروح ہوں گی تو گویا کہ اس نے طیبات آخرت کو نظر انداز کیا اور طیبات دنیا کو لے لیا۔ اس قسم کی روش چونکہ دنیا میں آدمی کو بظاہر کامیاب بناتی ہے اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں۔ لیکن موت جب اس کی نگاہ سے غفلت کا پردہ ہٹائے گی تو اچانک وہ محسوس کرے گا کہ اس نے ایک حقیر چیز کی خاطر کتنے بڑے فائدے کو کھو دیا۔

47-167

دلیل یا جھوٹی توجیہہ

کیا وہ اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل (بینۃ) پر ہے۔ وہ اس کی طرح ہو جائے گا

جس کی بدعملی اس کے لئے خوشنما بنادی گئی ہے اور وہ اپنی خواہشات پر چل رہے ہیں۔ جنت کی مثال جس کا وعدہ ڈرنے والوں سے کیا گیا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس میں تغیر نہ ہوگا اور نہریں ہوں گی شہد کی جو بالکل صاف ہوگا۔ اور ان کے لئے وہاں ہر قسم کے پھل ہوں گے۔ اور ان کے رب کی طرف سے بخشش ہوگی۔ کیا یہ لوگ ان جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور ان کو کھولتا ہوا پانی پینے کے لئے دیا جائے گا، پس وہ ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کردے گا۔ (محمد ۱۴۔۱۵)

دلیل (بینۃ) پر کھڑا ہونا اپنی زندگی کی تعمیر حقیقت واقعہ کی بنیاد پر کرنا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اہواء (اپنی خواہشات) پر کھڑا ہوتا ہے وہ حقیقت واقعہ سے انحراف کرتا ہے، وہ خدا کی دنیا میں خدا کی مرضی کے خلاف اپنی دنیا بنانا چاہتا ہے۔

موجودہ امتحان کی دنیا میں دونوں گروہ بظاہر یکساں مواقع پا رہے ہیں۔ مگر آخرت کی حقیقی دنیا میں صرف پہلا گروہ خدا کی ابدی نعمتوں میں حصہ پائے گا اور دوسرا گروہ ہمیشہ کے لئے ذلیل اور ناکام ہو کر رہ جائے گا۔

حق انتہائی واضح ہے۔ تمام دلیلیں اسی کی تائید کرتی ہیں۔ اس کے باوجود کیوں ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ حق کو چھوڑ کر ناحق کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کا سبب دلیل کا اتباع نہیں ہے بلکہ خواہش کا اتباع ہے۔ لوگوں کے لئے ان کی خواہشات محبوب ہوتی ہیں۔ اپنی خواہشات کو چھوڑنا انہیں گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے واضح دلائل کے باوجود لوگ حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ یہاں شیطان آدمی کی مدد کرتا ہے۔ وہ خوشنما توجیہات کے ذریعہ آدمی کو اس جھوٹے یقین میں مبتلا کر دیتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہی درست ہے۔

48-168

رسول اور اصحاب رسول

قرآن میں پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: محمد اللہ کے

رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے۔ وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا، وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے۔ تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ (الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں ـــــ یہ صرف ایک واقعہ کا بیان نہیں ہے بلکہ وہ اس کی دلیل بھی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی نے یہ اعلان کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو وہ واقعۃً اللہ کا رسول تھا۔ پیغمبر اسلام سے پہلے یا پیغمبر اسلام کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص جو اللہ کا رسول نہ ہو وہ اپنی زبان سے یہ جملہ بولے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ "میں اللہ کا رسول ہوں" اتنا زیادہ مشکل ہے کہ یہ جملہ صرف وہی شخص بولے گا جو واقعۃً اللہ کا رسول ہو گا، کوئی غیر رسول یہ جملہ بولنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتا۔ اور نہ کبھی تاریخ میں کسی نے اس قسم کی جرأت کی۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو الرسالہ، مارچ ۲۰۰۰۔

یہی اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ خدا کے آخری پیغمبر تھے۔ آپ کے بعد جب کوئی شخص یہ نہ کہہ سکا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں تو آپ کا دعویٰ غیر متنازعہ طور پر اپنے آپ تاریخ میں قائم ہے۔ آپ کو خاتم الرسل ثابت کرنے کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

اور جو لوگ رسول کے ساتھ ہیں ـــــ یہ بظاہر ایک سادہ جملہ ہے جو اصحابِ رسول سے متعلق ہے۔ لیکن جب اس پر غور کیا جائے کہ یہ اولین لوگ کیسے پیغمبر اسلام کے ساتھی بنے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک سادہ جملہ نہیں بلکہ اس کے اندر ایک انتہائی اہم حقیقت چھپی ہوئی ہے۔

اسلام کے دور اول میں پیغمبر کی تصویر، قرآن کے الفاظ میں صرف ایک بشر جیسی تھی۔ وہ لوگوں کو بس محمد بن عبد اللہ کے روپ میں دکھائی دیتے تھے۔ لیکن آج آپ کے نام کے ساتھ

اتنی زیادہ تاریخی عظمتیں جمع ہو چکی ہیں کہ ایک غیر مسلم محقق بھی مجبور ہے کہ آپ کو تمام پیدا ہونے والے انسانوں میں سب سے بڑا انسان قرار دے۔ گویا آپ کے ابتدائی پیروؤں نے "محمد بدون تاریخ" میں آپ کے رسولِ خدا ہونے کی حقیقت کو دریافت کیا۔ جب کہ آج کا ایک شخص "محمد بشمول تاریخ" میں آپ کے رسول خدا ہونے کا اعتراف کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے اولین پیروؤں نے آپ کے رسول خدا ہونے کو اس وقت مانا جب کہ آپ اپنی اضافی حیثیت کے بغیر مجرد روپ میں ان کے سامنے ظاہر ہوئے تھے۔ جب کوئی شخص اس طرح پیغمبر کو اس کی اضافی نسبتوں کے بغیر مجرد روپ میں جان لے تو ایسے آدمی کا ایمان ایک گہری معرفت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایک عظیم دریافت (Discovery) کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ایسی دریافت آدمی کے پورے وجود میں ایک مکمل فکری اور روحانی انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ اس انقلاب کے بعد اس کی جو شخصیت بنتی ہے، اس کا ذکر آیت کے اگلے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

پیروان رسول کی ایک صفت یہ بتائی گئی کہ وہ منکروں پر (اشداء علی الکفار) ہیں۔ یہاں سخت یا شدید کا مطلب کڑا پن یا درشتی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر اہل اسلام کی غیر اسلامی باتوں کا اثر قبول نہیں کرتے۔ عربی میں کہا جاتا ہے: هو شديدٌ عليَّ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ میرے ساتھ سخت معاملہ کرتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ میرا اثر قبول نہیں کرتا۔ مومن ایک با اصول انسان ہوتا ہے۔ وہ بے اصول لوگوں یا مفاد پرستی کے علمبرداروں سے غیر متاثر ہو کر رہتا ہے۔ وہ خود اپنے طے کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی زندگی کی تعمیر کرتا ہے۔ وہ کبھی کسی خلاف حق رواج کا اثر قبول نہیں کرتا۔

وہ آپس میں مہربان ہیں (رحماء بینهم) ــــــ لوگوں سے مہربانی کے ساتھ پیش آنا انسانیت کا اعلیٰ ترین تقاضہ ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اہل ایمان اپنے لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے رحیم و شفیق ہوں۔ اور جب دوسروں سے معاملہ پیش آئے تو وہ ان کے ساتھ اس

کے برعکس عمل کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ رحمت و شفقت اہل ایمان کی ایک مستقل اور عمومی صفت ہے جو ایک کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہے، خواہ وہ اپنا ہو یا کوئی غیر۔

آپس میں مہربان ہونے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے فرمایا کہ آپس میں مہربان ہونا نسبتاً زیادہ مشکل کام ہے۔ جو آدمی اپنوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرے وہ غیروں کے ساتھ بھی ضرور رحمت و شفقت کا معاملہ کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کے درمیان ہمیشہ ملنا جلنا زیادہ ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ معاملات پیش آتے ہیں۔ لین دین کی عملی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنے لوگوں سے اکثر شکایت اور نزاع پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ غیروں کے مقابلہ میں شفقت کا معاملہ اگر سادہ طور پر صرف شفقت کرنے کا معاملہ ہے تو اپنوں کے مقابلہ میں شفقت کا معاملہ شکایت اور نزاع کے باوجود شفقت کا معاملہ۔ اپنوں کے مقابلہ میں رحیم ثابت ہونا زیادہ بڑی جانچ میں پورا اترنا ہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے کہ جو آدمی بڑی جانچ میں پورا اترے وہ چھوٹی جانچ میں بدرجہ اولیٰ پورا اترے گا۔

تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے ـــــــ یہ اہل ایمان کی اس کیفیت کی تصویر ہے جو ان کے اندر خدا کی نسبت سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا پر ایمان ان کے لئے خدا کی عظمت کی دریافت کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہ دریافت ان کے سینہ کو خشوع اور تواضع سے بھر دیتی ہے۔ اس کا مظاہرہ بار بار عبادت اور رکوع اور سجود کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔

وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں ـــــــ ایمان آدمی کے اندر یہ شعور پیدا کرتا ہے کہ ساری طاقتیں صرف ایک خدا کے پاس ہیں۔ وہ دینے والا ہے اور انسان اس سے پانے والا۔ یہ شعور اس کی زندگی میں اس طرح ڈھل جاتا ہے کہ وہ ہر چیز کو خدا کا فضل سمجھنے لگتا ہے۔ اس کی ہر سرگرمی خدا کی خوشنودی کی تلاش میں بدل جاتی ہے۔

ان کی نشانی اُن کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے ـــــــ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ آدمی کی اندرونی کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہے۔ آدمی اندر سے خوش ہے یا غمگین،

دونوں حالتوں میں اس کا چہرہ اس کی داخلی حالت کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص حقیقی معنوں میں سجدہ گزار ہو، اس کا وجود ایمان کی کیفیات سے بھر گیا ہو تو اس کے چہرے پر اس کے اثرات اس طرح ظاہر ہو جائیں گے کہ دیکھنے والا اس کے ظاہر سے اس کے باطن کو پڑھ سکے۔ یہ اہل ایمان کی انفرادی خصوصیات ہیں جن کا ذکر پیشگی طور پر تورات میں کیا گیا تھا۔ اصحاب رسول کی یہ صفت موجودہ تبدیل شدہ تورات میں قدسیوں (Saints) کے لفظ کی صورت میں پائی جاتی ہے۔ (کتاب استثناء باب ۳۳)

انجیل (مرقس، باب ۴) میں اس گروہ کے اجتماعی اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس اجتماعی خصوصیت کو مذکورہ قرآنی آیت کے آخر میں کھیتی یا زرعی فصل کی تمثیل کے ذریعہ اس طرح بتایا گیا ہے کہ سچے اہل اسلام خدا کی زمین میں درخت کی طرح اگتے اور بڑھتے ہیں۔ وہ پودے سے آغاز کر کے ہرا بھرا باغ بن جاتے ہیں۔ اہل اسلام کا گروہ پودے کی صورت میں ایک ابتدائی مقام سے ابھرتا ہے۔ پھر وہ بڑھتے بڑھتے ایک طاقتور درخت بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا استحکام اس درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ اہل حق اس کو دیکھ کر خوش ہوں اور اہلِ باطل غیظ و حسد میں مبتلا ہو کر رہ جائیں کہ چاہنے کے باوجود وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مذکورہ انفرادی اور اجتماعی صفات میں پورے اتریں ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو مغفرت اور اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ یہاں مغفرت سے مراد آخرت کی کامیابی ہے اور اجر عظیم سے مراد دنیا کی کامیابی۔ آخرت کی کامیابی انہیں جنت کی صورت میں ملے گی اور دنیا کی کامیابی ملی وقار اور فکری غلبہ کی صورت میں۔

49-169

محتاط مزاج

اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کئے پر پچھتانا پڑے، اور

جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسول ہے۔ اگر وہ بہت سے معاملات میں تمہاری بات مان لے تو تم بڑی مشکل میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب بنا دیا، اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل اور انعام سے راست پر ہیں۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے (الحجرات ٦۔٨)

ایک آدمی کو اگر کوئی ایسی خبر ملے جس میں اس آدمی پر کوئی الزام آتا ہو تو ایسی خبر کو محض سن کر مان لینا ایمانی احتیاط کے سراسر خلاف ہے۔ سننے والے پر لازم ہے کہ وہ اس کی ضروری تحقیق کرے، اور جو رائے قائم کرے، غیر جانب دارانہ تحقیق کے بعد کرے نہ کہ تحقیق سے پہلے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بری خبر ایک شخص کو ملتی ہے تو فوراً ہی اس کو مان کر اس کے خلاف جوابی اقدام کا منصوبہ بنانے لگتا ہے۔ یہ سخت غیر ذمہ داری کی بات ہے۔ نہ کسی آدمی کو ایسی خبر پر قبل از تحقیق کوئی رائے قائم کرنا چاہئے اور نہ دوسروں کو قبل از تحقیق اقدام کا مشورہ دینا چاہئے۔

جو لوگ واقعی ہدایت کے راستہ پر آ جائیں ان کے اندر انتہائی محتاط مزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسروں پر الزام تراشی سے انہیں نفرت ہو جاتی ہے۔ غیر تحقیق بات پر بولنے سے زیادہ وہ اس پر چپ رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا یہ مزاج اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ان کو خدا کی رحمتوں سے حصہ ملا ہے۔ وہ ایمان فی الواقع ان کی زندگیوں میں اترا ہے جس کا وہ اپنی زبان سے اقرار کر رہے ہیں۔

49-170

نزاع کے وقت

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کراؤ اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، پس اپنے بھائیوں کے درمیان ملاپ کراؤ اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے (الحجرات ٩۔١٠)

مسلمان آپس میں کس طرح رہیں، اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ اس طرح رہیں جس طرح بھائی بھائی آپس میں رہتے ہیں۔ دینی رشتہ خونی رشتہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اگر دو مسلمان آپس میں لڑ جائیں تو بقیہ مسلمانوں کو ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ان کے درمیان مزید آگ بھڑکائیں۔ بلکہ انہیں بھائیوں والے جذبہ کے تحت دونوں کے درمیان مصالحت کے لئے اٹھ جانا چاہئے۔

دو مسلمان جب آپس میں لڑ جائیں تو ایک صورت یہ ہے کہ بقیہ مسلمان غیر جانب دار بن جائیں۔ یا اگر وہ دخل دیں تو اس طرح کہ خاندانی اور گروہی عصبیت کے تحت اپنوں سے مل کر غیروں سے لڑنے لگیں۔ یہ تمام طریقے اسلام کے خلاف ہیں۔ صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اصل معاملہ کی تحقیق کی جائے اور جو شخص حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور جو شخص ناحق پر ہو اس کو مجبور کیا جائے کہ وہ معاملہ کے منصفانہ فیصلہ پر راضی ہو۔

اللہ سے ڈرنے والا آدمی کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کو لڑتے ہوئے دیکھ کر اس سے لذت لے۔ وہ ایسے منظر کو دیکھ کر تڑپ گا۔ اس کا مزاج اسے مجبور کرے گا کہ وہ دونوں کے درمیان تعلقات کو درست کرانے کی کوشش کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے اللہ پر ایمان اللہ کی رحمتوں کا دروازہ کھولنے کا سبب بن جاتا ہے۔

49-171

معاشرتی اخلاق

اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد گناہ کا نام لگنا برا ہے۔ اور جو باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (الحجرات 11)

ہر آدمی کے اندر پیدائشی طور پر بڑا بننے کا جذبہ چھپا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص کو

دوسرے شخص کی کوئی بات مل جائے تو وہ اس کو خوب نمایاں کرتا ہے تاکہ اس طرح اپنے کو بڑا اور دوسرے کو چھوٹا ثابت کرے۔ وہ دوسرے کا مذاق اڑاتا ہے، وہ دوسرے پر عیب لگاتا ہے، وہ دوسرے کو برے نام سے یاد کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے اپنی بڑائی کے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔

مگر اچھا اور برا ہونے کا معیار وہ نہیں ہے جو آدمی بطور خود مقرر کر لے۔ اچھا در اصل وہ ہے جو خدا کی نظر میں اچھا ہو اور برا وہ ہے جو خدا کی نظر میں برا ٹھہرے۔ اگر آدمی کے اندر فی الواقع اس کا احساس ہو جائے تو اس سے بڑائی کا جذبہ چھن جائے گا۔ دوسرے کا مذاق اڑانا، دوسرے کو طعنہ دینا، دوسرے پر عیب لگانا، دوسرے کو برے لقب سے یاد کرنا، سب اس کو بے معنی معلوم ہونے لگیں گے۔ کیوں کہ وہ جانے گا کہ لوگوں کے درجہ و مرتبہ کا اصل فیصلہ خدا کے یہاں ہونے والا ہے؛ پھر اگر آج میں کسی کو حقیر سمجھوں اور آخرت کی حقیقی دنیا میں وہ باعزت قرار پائے تو میرا اس کو حقیر سمجھنا کس قدر بے معنی ثابت ہوگا۔

49-172

بری رائے قائم کرنا

اے ایمان والو، بہت سے گمانوں سے بچو، کیوں کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور ٹوہ میں نہ لگو۔ اور تم سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ اس کو تم خود ناگوار سمجھتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (الحجرات ۱۲)

ایک آدمی کسی شخص کے بارہ میں بد گمان ہو جائے تو اس کی ہر بات اس کو غلط معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کے بارہ میں اس کا ذہن منفی رخ پر چل پڑتا ہے۔ اس کی خوبیوں سے زیادہ وہ اس کے عیوب تلاش کرنے لگتا ہے۔ اس کی برائیوں کو بیان کر کے اسے بے عزت کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔

اکثر سماجی خرابیوں کی جڑ بد گمانی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی اس معاملہ میں چوکنا

رہے۔ وہ بدگمانی کو اپنے ذہن میں داخل نہ ہونے دے۔

آپ کو کسی سے بدگمانی ہو جائے تو آپ اس سے مل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر یہ سخت غیر اخلاقی فعل ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہا جائے جب کہ وہ اپنی صفائی کے لئے وہاں موجود نہ ہو۔ وقتی طور پر کبھی آدمی سے اس قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ اللہ سے ڈرنے والا ہے تو وہ اپنی غلطی پر ڈھیٹ نہیں ہو گا۔ اس کا خوفِ خدا اس کو فوراً اپنی غلطی پر متنبہ کرے گا۔ وہ اپنی روش کو چھوڑ کر اللہ سے معافی کا طالب بن جائے گا۔

کسی کی غیر موجودگی میں اس کو برا کہنا بلاشبہ سخت غیر اخلاقی فعل ہے۔ مگر اس کا تعلق شخصی برائی سے ہے، نہ کہ نظریاتی غلطی سے۔ اگر ایک شخص کوئی نظریاتی غلطی کرے اور اس کو چھاپ کر پھیلائے تو یقیناً اس کا رد کیا جائے گا، خواہ وہ مقام تردید پر موجود ہو یا نہ ہو۔

49-173

فرق واختلاف

اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔ (الحجرات ۱۳)

انسانوں کے درمیان مختلف قسم کے فرق ہوتے ہیں۔ کوئی سفید ہے اور کوئی کالا۔ کوئی ایک نسل سے ہے اور کوئی دوسری نسل سے۔ کوئی ایک جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے اور کوئی دوسرے جغرافیہ سے یہ تمام فرق صرف تعارف کے لئے ہیں نہ کہ امتیاز کے لئے۔ اکثر خرابیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس قسم کے ظاہری اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کے درمیان درجہ کے اعتبار سے فرق کرنے لگتے ہیں۔ اس سے وہ تفریق اور تعصب وجود میں آتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

تمام انسان اپنے آغاز کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی اگر کوئی بنیاد ہے تو وہ

صرف یہ ہے کہ کون اللہ سے ڈرنے والا ہے اور کون اللہ سے ڈرنے والا نہیں۔ اور اس کا بھی صحیح علم صرف خدا کو ہے نہ کہ کسی انسان کو۔

انسانوں کے درمیان جو فرق یا تنوع نظر آتا ہے وہ معاشرتی اور تمدنی مصلحتوں کی بنا پر ہے نہ کہ امتیاز یا تفوق کی بنا پر۔ یہ فرق سماجی زندگی کی تعمیر اور تہذیب کے ارتقاء میں مددگار ہوتا ہے۔ جہاں تک انسانی شرف کا سوال ہے، اس کا تعلق ہر آدمی کے اپنے اخلاقی اوصاف پر ہے۔ یہ دراصل اخلاقی صفات ہیں جو کسی انسان کو پست اور کسی انسان کو بلند کرتی ہیں۔ نہ کہ ظاہری علامتیں۔

50-174

قول و عمل کا ریکارڈ

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں ان باتوں کو جو اس کے دل میں آتی ہیں۔ اور ہم رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔ جب دو لینے والے لیتے رہتے ہیں جو کہ دائیں اور بائیں طرف بیٹھے ہیں۔ کوئی لفظ وہ نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک مستعد نگراں موجود ہے۔ (ق ۱۶۔۱۸)

دنیا کا علمی مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں فطری طور پر "ریکارڈنگ" کا نا قابل خطا نظام موجود ہے۔ انسان کی سوچ اس کے ذہنی پردہ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو رہی ہے۔ انسان کا ہر بول لہروں کی صورت میں مستقل طور پر باقی رہتا ہے۔ انسان کا عمل حرارتی لہروں کے ذریعہ خارجی دنیا میں اس طرح محفوظ ہو جاتا ہے کہ اس کو کسی بھی وقت دہرا لیا جا سکے۔

یہ سب آج کی معلوم حقیقتیں ہیں۔ اور یہ معلوم حقیقتیں قرآن کی اس خبر کو قابل فہم بنا رہی ہیں کہ انسان کی نیت، اس کا قول اور اس کا عمل سب کچھ خالق کے علم میں ہے۔ انسان کی ہر چیز فرشتوں کے رجسٹر میں درج کی جا رہی ہے۔ اس معاملہ میں علمی مطالعہ اور الہامی خبر کے درمیان یہ فرق ہے کہ جس واقعہ کو ہم قانونِ فطرت کے تحت ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اسی کو قرآن خدائی فرشتوں کی طرف منسوب کر رہا ہے۔ گویا کہ دونوں میں جو فرق ہے وہ صرف انتساب میں ہے نہ کہ نفس واقعہ کی موجودگی میں۔

50-175

صابرانہ عمل

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں بنایا اور ہم کو کچھ تکان نہیں ہوئی۔ پس جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرو حمد کے ساتھ، سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے۔ اور رات میں اس کی تسبیح کرو اور سجدوں کے پیچھے (ق ۳۸-۴۰)

زمین و آسمان کو چھ دنوں، بالفاظ دیگر چھ دوروں میں پیدا کرنا بتاتا ہے کہ خدا کا طریقہ تدریجی عمل کا طریقہ ہے۔ اور جب خدا ساری طاقتوں کا مالک ہونے کے باوجود واقعات کو تدریج کے ساتھ لمبی مدت میں ظہور میں لاتا ہے تو انسان کو بھی چاہئے کہ وہ جلد بازی سے بچے، وہ صابرانہ عمل کے ذریعہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دعوت کا عمل شروع سے آخر تک صبر کا عمل ہے۔ اس میں انسان کی طرف سے پیش آنے والی تلخیوں کو سہنا پڑتا ہے۔ اس میں نتیجہ سامنے دکھائی نہ دینے کے باوجود اپنے عمل کو جاری رکھنا پڑتا ہے۔ اس صبر آزما عمل پر وہی شخص قائم رہ سکتا ہے جس کے صبح و شام ذکر اور عبادت میں گزرتے ہوں، جو انسانوں سے نہ پاکر خدا سے پا رہا ہو، جو سب کچھ کھو کر بھی احساس محرومی کا شکار نہ ہو سکے۔

51-176

صفت نطق

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے۔ اور خود تمہارے اندر بھی۔ کیا تم دیکھتے نہیں اور آسمان میں تمہاری روزی ہے اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس آسمان اور زمین کے رب کی قسم، وہ یقینی ہے جیسا کہ تم بولتے ہو (الذاریات ۲۰-۲۳)

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ موجودہ معلوم دنیا بعد کو آنے والی نامعلوم دنیا کی نشانی بن گئی ہے۔ زمین میں پھیلے ہوئے مادی واقعات اور انسان کے اندر چھپے ہوئے احساسات

دونوں بالواسطہ انداز میں اس واقعہ کی پیشگی خبر دے رہے ہیں جو موت کے بعد براہ راست انداز میں انسان کے سامنے آنے والا ہے۔ انہیں نشانیوں میں سے ایک نشانی نطق (بولنا) ہے۔

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ آخرت میں جو کچھ ملے گا وہ خود آدمی کے اپنے اعمال ہوں گے جو اس کی طرف لوٹا دئے جائیں گے (انما ھی اعمالکم ترد علیکم) گویا آخرت کی دنیا موجودہ دنیا ہی کا مثنی (double) ہے۔ آدمی کا نطق اسی امکان کا ایک جزئی مظاہرہ ہے۔ آدمی کی آواز ٹیپ پر ریکارڈ کر دی جائے اور پھر ٹیپ کو بجایا جائے تو آدمی کے مرنے کے بعد بھی عین وہی آواز اس سے نکلتی ہے جو انسان کی آواز تھی۔ ٹیپ کی آواز انسان کی اصل آواز کا مثنی (double) ہے، اس طرح انسان کی آواز جزئی سطح پر اس واقعہ کا تجربہ کرا رہی ہے جو کلی سطح پر آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ جب ایک مرے ہوئے انسان کی ہستی آواز کی صورت میں جزئی طور پر قابل اعادہ ہے تو انسان کی پوری ہستی کیوں نا قابل اعادہ ہو جائے گی۔ نطق کا یہ ظاہرہ حیات بعد الممات کا ایک واقعاتی ثبوت ہے۔

51-177

کائنات کا مطالعہ

اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہم کشادہ کرنے والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے بچھایا، پس کیا ہی خوب بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا ہے تاکہ تم دھیان کرو۔ پس دوڑو اللہ کی طرف، میں اس کی طرف سے ایک کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بناؤ، میں اس کی طرف سے تمہارے لئے کھلا ڈرانے والا ہوں (الذاریات ۴۷۔۵۱)

"ہم آسمان کو کشادہ کرنے والے ہیں" اس فقرہ میں غالباً کائنات کی اس نوعیت کی طرف اشارہ ہے جو صرف حال میں دریافت ہوئی ہے۔ یعنی کائنات کا مسلسل اپنے چاروں طرف پھیلنا۔ کائنات کا اس طرح پھیلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو کسی پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔

کیوں کہ اس پھیلاؤ کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ابتداء میں وہ سمٹی ہوئی تھی۔ معلوم مادی قانون کے مطابق، کائنات کے اس ابتدائی گولے کے تمام اجزاء اندر کی طرف کھنچے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں ان کا بیرونی طرف سفر کرنا کسی خارجی مداخلت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اور خارجی مداخلت کو ماننے کے بعد خدا کے وجود کو ماننا لازم ہو جاتا ہے۔

ہماری دنیا کا نظام انتہائی با معنی نظام ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا کی تخلیق کسی اعلیٰ مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان نے زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ با معنی کائنات میں یہ بے معنی واقعہ بالکل بے جوڑ ہے۔ یہ صورت حال تقاضہ کرتی ہے کہ ایک ایسی دنیا بنے جو ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو۔

یہاں دوبارہ موجودہ دنیا کے اندر ایک ایسا واقعہ موجود ہے جو اس سوال کا جواب دیتا ہے۔ اور وہ ہے یہاں کی تمام چیزوں کا جوڑے جوڑے ہونا۔ مادہ میں مثبت اور منفی ذرے، نباتات میں نر اور مادہ، انسان میں عورت اور مرد۔ اس سے کائنات کا یہ مزاج معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشیاء کی کمی کو اس کے جوڑے کے ذریعہ مکمل کرنے کا قانون رائج ہے۔ یہ ایک قرینہ ہے جو آخرت کے امکان کو ثابت کرتا ہے۔ آخرت کی دنیا گویا موجودہ دنیا کا دوسرا جوڑا ہے جس سے مل کر ہماری دنیا اپنے آپ کو مکمل کرتی ہے۔

52-178

سب سے بڑا عمل

بے شک متقی لوگ باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ خوش دل ہوں گے ان چیزوں سے جو ان کے رب نے انہیں دی ہوں گی۔ اور ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے بچالیا، کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ اپنے اعمال کے بدلے میں تکیہ لگائے ہوئے صف بہ صف تختوں کے اوپر۔ اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ان سے بیاہ دیں گے۔ (الطور ۱۷۔۲۰)

انسان کا سب سے بڑا جرم حق کو جھٹلانا ہے۔ اسی سے بقیہ تمام جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ اسی

طرح انسان کی سب سے بڑی نیکی حق کا اعتراف ہے۔ تمام دوسری نیکیاں اسی سے بطور نتیجہ ظاہر ہوتی ہیں۔

حق کو ماننے سے آدمی کی بڑائی ٹوٹتی ہے۔ یہ کسی انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس پر وہی لوگ پورے اترتے ہیں جن کو اللہ کے ڈرنے آخری حد تک سنجیدہ بنا دیا ہو۔ جو لوگ اس سب سے بڑی نیکی کا ثبوت دیں وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے لئے جنت کی ابدی نعمتوں کے دروازے کھول دئے جائیں۔

52-179

بے غرضی

قرآن میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: کیا تم ان سے معاوضہ مانگتے ہو کہ وہ تاوان کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں۔ کیا ان کے پاس غیب ہے۔ کیا وہ لکھ لیتے ہیں۔ کیا وہ کوئی تدبیر کرنا چاہتے ہیں۔ پس انکار کرنے والے خود ہی اس تدبیر میں گرفتار ہوں گے۔ کیا اللہ کے سوا ان کا اور کوئی معبود ہے۔ اللہ پاک ہے ان کے شریک بنانے سے۔ (الطور ۴۰۔۴۳)

مدعو گروہ ہمیشہ مادہ پرستی کی سطح پر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مدعو کو اگر یہ احساس ہو کہ داعی اس سے اس کی کوئی مادی چیز لینا چاہتا ہے تو وہ فوراً اس کی طرف سے متوحش ہو جائے گا۔ وہ داعی کے پیغام پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کی کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے اور مخاطبین کے درمیان کسی قسم کے مادی مطالبہ کی بات کبھی نہ آنے پائے۔ اس کے اور مخاطبین کے درمیان آخر وقت تک بے غرضی کی فضا باقی رہے۔ خواہ اس کے لئے اسے یک طرفہ طور پر مادی نقصان برداشت کرنا پڑے۔

داعی جب اپنی دعوت کے حق میں اس حد تک سنجیدگی کا ثبوت دے دے تو اس کے بعد وہ خدا کی اس نصرت کا مستحق ہو جاتا ہے کہ منکرین کی ہر تدبیر ان کے اوپر الٹی پڑے۔ وہ کسی بھی طرح داعی کو مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہوں۔

53-180

حق سے اعراض

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اعراض کیا۔ تھوڑا سا دیا اور رک گیا۔ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے۔ پس وہ دیکھ رہا ہے۔ (النجم ۳۳۔۳۵)

بہت سے لوگ جو تھوڑا سا حق کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ پھر ان کے مفادات ان پر غالب آتے ہیں۔ اور وہ دوبارہ اپنی پچھلی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنی غلط روش کی تاویل کے لئے طرح طرح کے خوبصورت عقیدے بنا لیتے ہیں۔ مگر اس قسم کی باتیں صرف ان کے جرم کو بڑھاتی ہیں۔ یہ غلطی پر سرکشی کے اضافہ کے ہم معنی ہے۔

دعوت حق کے مقابلہ میں اعراض کا یہ طریقہ اختیار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ حق کی دعوت اپنی حقیقت کے اعتبار سے موجودہ دنیا میں خدا کی نمائندگی ہوتی ہے اس لئے ایسی دعوت کو نظر انداز کرنا گو خود خدا کو نظرانداز کرنا ہے۔ اس قسم کی روش بلاشبہ خدا کے یہاں قابل معافی نہیں۔

53-181

سببِ اعلیٰ

اور بے شک وہی ہنساتا ہے اور رلاتا ہے۔ اور وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ اور اسی نے دونوں قسم، نر اور مادہ کو پیدا کیا، ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکائی جائے۔ اور اسی کے ذمہ ہے دوسری بار اٹھانا۔ اور اسی نے دولت دی اور سرمایادار بنایا۔ اور وہی شعریٰ کا رب ہے (النجم ۴۳۔۴۹)

دنیا کے ہر واقعہ کا تعلق ایسے ماورائی اسباب سے ہوتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس کے ظہور پر قادر نہیں ہو سکتا۔ خوشی اور غم، موت وحیات، تخلیقی نظام، امیری اور غریبی، سب ایک بلند و برتر طاقت کا کرشمہ ہیں۔ قدیم انسان ستاروں کو سبب حیات سمجھتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں قانون فطرت کو سبب حیات سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان اسباب کے اوپر بھی ایک سبب ہے اور وہ خدائے رب العلمین ہے۔ پھر اس کے سوا کسی اور کو مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

54-182

سیاسی اقتدار

اور فرعون والوں کے پاس پہنچے ڈرانے والے۔ انہوں نے ہماری تمام نشانیوں کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ایک غالب اور قوت والے کے پکڑنے کی طرح پکڑا (القمر ۴۱۔۴۲)

فرعون قدیم مصر کا حکمراں تھا۔ اس کی سلطنت رقبہ کے اعتبار سے موجودہ مصر سے بہت بڑی تھی۔ وہ اپنے وقت کا ایک طاقت ور بادشاہ تھا۔ مگر حق کا انکار کرنے کے بعد وہ اللہ کی نظر میں بے قیمت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ایک عاجز انسان کی طرح ہلاک کر دیا گیا۔ اس دنیا میں حق کے ساتھ کھڑا ہونے والا آدمی زور آور ہے اور حق کے خلاف کھڑا ہونے والا آدمی بے زور۔

سیاسی اقتدار کسی کا حق نہیں۔ سیاسی اقتدار جس کو بھی ملتا ہے، امتحان کے لئے ملتا ہے، خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ جس فرد یا قوم کو خدا اقتدار دے، اس کو اسے امتحان کی نظر سے دیکھنا چاہئے۔ اس کی ساری توجہ اس پر ہونا چاہئے کہ وہ اس خدائی امتحان میں پورا اترے۔ سیاسی اقتدار کو عزت سمجھنا یا اس کو اپنی ذاتی عظمت قائم کرنے کے لئے استعمال کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے امتحان میں ناکام ہو گیا۔

54-183

خدا کا فیصلہ

ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اندازہ سے۔ اور ہمارا حکم بس یکباری گی آجائے گا جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ اور ہم ہلاک کر چکے ہیں تمہارے ساتھ والوں کو، پھر کیا کوئی ہے سوچنے والا، اور جو کچھ انہوں نے کیا سب کتابوں میں درج ہے۔ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے۔ بے شک ڈرنے والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔ بیٹھے سچی بیٹھک میں، قدرت والے بادشاہ کے پاس۔ (القمر ۴۹۔۵۵)

دنیا کی ہر چیز کا ایک مقرر ضابطہ ہے۔ یہی اصول انسان کے معاملہ میں بھی ہے۔ انسان کو

ایک مقرر ضابطہ کے تحت موجودہ دنیا میں عمل کا موقع دیا گیا ہے۔ اور مقرر ضابطہ ہی کے تحت اس کو عمل کے مقام سے ہٹا کر انجام کے مقام میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ خالق کی قدرت جو موجودہ کائنات میں ظاہر ہوئی ہے وہ یہ یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ یہ معاملہ عین اپنے وقت پر بلا تاخیر پیش آئے گا۔ اسی طرح موجودہ دنیا میں ریکارڈنگ کا نظام اس حقیقت کا پیشگی اعلان ہے کہ ہر ایک کے ساتھ عین وہی معاملہ کیا جائے گا جو اس کے عمل کے مطابق ہو، تاہم یہ باتیں اسی شخص کی سمجھ میں آئیں گی جو اپنے اندر یہ مزاج رکھتا ہو کہ وہ واقعات پر غور کرے اور ظاہر سے گزر کر باطن میں چھپی ہوئی حقیقتوں کو دیکھ سکے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو پوری آزادی حاصل ہے۔ اس لئے موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ آدمی مقعد کذب (جھوٹی نشست) پر بیٹھ کر نمایاں ہو سکے۔ وہ جھوٹ کی زمین پر عزت اور مرتبہ کا مقام حاصل کر لے۔ مگر آخرت میں کسی کے لئے ایسا ممکن نہ ہوگا۔ آخرت میں عزت اور کامیابی صرف ان لوگوں کو ملے گی جو مقعد صدق (سچی نشست) پر بیٹھنے والے ہوں۔ جنہوں نے فی الواقع اپنے آپ کو سچ کی زمین پر کھڑا کیا ہو۔ آخرت میں خدا کی قدرت کامل کا ظہور اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ وہاں مقعد صدق کے سوا کسی اور مقعد پر بیٹھنا کسی کے کچھ کام نہ آسکے۔

55-184

قرآن اور کائنات

رحمٰن نے، قرآن کی تعلیم دی، اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند کے لئے ایک حساب ہے۔ اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس نے ترازو رکھ دی۔ کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور تول میں نہ گھٹاؤ (الرحمٰن ۱۔۹)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا۔ اس کو نطق کی انوکھی صلاحیت دی جو ساری معلوم کائنات

میں کسی کو حاصل نہیں۔ پھر انسان سے جو عادلانہ روش مطلوب تھی اس کا عملی نمونہ اس نے کائنات میں قائم کر دیا۔ انسان کے گردوپیش کی پوری دنیا عین اسی اصول عدل پر قائم ہے جو انسان سے اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور قرآن میں اسی عدل کو لفظی طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن خدائی عدل کا لفظی اظہار ہے اور کائنات خدائی عدل کا عملی اظہار۔ بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول و عمل کو اسی ترازو سے ناپتے رہیں۔ وہ نہ لینے میں بے انصافی کریں اور نہ دینے میں۔

انسان کی فطرت اگر زندہ ہو۔ وہ اپنی گردوپیش کی دنیا کو کھلی آنکھ سے دیکھے اور کھلے ذہن سے سمجھے تو وہ پھیلی ہوئی دنیا میں وہ سب کچھ پالے گا جو اسے کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔ وہ کائنات میں جو کچھ دیکھے گا اسی کو قرآن میں پڑھے گا، اور قرآن میں جو کچھ پڑھے گا وہی اسے کائنات کے کارخانے میں دکھائی دے گا۔ قرآن میں اگر ہدایت کی کتاب ہے تو کائنات ہدایت پائی ہوئی عملی زندگی کا نمونہ۔

55-185

خدا کی نعمتیں

اور زمین کو اس نے خلق کے لئے رکھ دیا۔ اس میں میوے ہیں اور کھجور ہیں جس کے اوپر غلاف ہوتا ہے۔ اور بھس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے اور اس نے جنات کو آگ کی لپٹ سے پیدا کیا۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ وہ مالک ہے دونوں مشرق کا اور دونوں مغرب کا۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اس نے چلائے دو دریا، مل کر چلنے والے۔ دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ ان دونوں سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ اور اسی کے ہیں جہاز، سمندر میں اونچے کھڑے ہوئے جیسے پہاڑ، پھر تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے (الرحمٰن ۱۰۔۲۵)

اس دنیا کا بیشتر حصہ ستاروں پر مشتمل ہے جو سراپا آگ ہیں۔ جنات اسی آگ کے مادہ سے بنائے گئے ہیں۔ مگر انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی معاملہ ہے کہ اس کو "مٹی" سے بنایا گیا ہے جو وسیع کائنات میں انتہائی نادر چیز ہے۔

زمین ساری کائنات میں ایک انوکھا استثناء ہے۔ یہاں وہ تمام اسباب حد درجہ توازن اور تناسب کے ساتھ مہیا کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ انسان جیسی مخلوق کے لئے رہنا اور تمدن کی تعمیر کرنا ممکن ہو سکے۔ انہی انتظامات میں سے ایک انتظام زمین میں مشرقین اور مغربین کا ہونا ہے۔ جاڑے کے موسم میں سورج کے طلوع و غروب کے مقامات دوسرے ہوتے ہیں۔ اور گرمی کے موسم میں دوسرے۔ اس لحاظ سے اس کے مشرق و مغرب کئی ہو جاتے ہیں۔ یہ موسمی فرق فضا میں زمین کے محوری جھکاؤ (axial tilt) کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ جھکاؤ کائنات کا ایک انتہائی انوکھا واقعہ ہے اور اس سے بے شمار تمدنی فائدے انسان کو حاصل ہوتے ہیں۔

ناقابل قیاس حد تک وسیع کائنات میں انسان اور زمین کا یہ استثناء خدا کی نعمت و قدرت کا ایسا عظیم معاملہ ہے کہ انسان کسی بھی طرح اس کا شکر ادا کرنے پر قادر نہیں۔

56-186

نظامِ خداوندی

ہم نے تم کو پیدا کیا ہے۔ پھر تم تصدیق کیوں نہیں کرتے۔ کیا تم نے غور کیا اس چیز پر جو تم ٹپکاتے ہو۔ کیا تم اس کو بناتے ہو یا ہم ہیں بنانے والے۔ ہم نے تمہارے درمیان موت مقدر کی ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری جگہ تمہارے جیسے پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جن کو تم جانتے نہیں۔ اور تم پہلی پیدائش جانتے ہو پھر کیوں سبق نہیں لیتے۔ کیا تم نے غور کیا اس چیز پر جو تم بولتے ہو۔ کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیں۔ پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔ ہم تو تاوان میں پڑ گئے۔ بلکہ ہم بالکل محروم ہو گئے۔ کیا تم نے غور کیا اس پانی پر جو تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے۔ یا ہم ہیں اتارنے

والے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کو سخت کھاری بنادیں۔ پھر تم شکر کیوں نہیں کرتے۔ کیا تم نے غور کیا اس آگ پر جس کو تم جلاتے ہو۔ کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے درخت کو یا ہم ہیں اس کے پیدا کرنے والے۔ ہم نے اس کو یاد دہانی بنایا ہے۔ اور مسافروں کے لئے فائدہ کی چیز۔ پس تم اپنے عظیم رب کے نام کی تسبیح کرو (الواقعہ ۷۴۔۵۷)

ماں کے پیٹ سے انسان کا پیدا ہونا، زمین سے کھیتی کا اگنا، بارش سے پانی کا برسنا، ایندھن سے آگ کا حاصل ہونا، یہ سب چیزیں براہ راست خدا کی قدرت کے تحت ہوتی ہیں۔ آدمی کو ان کے ملنے پر خدا کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ ان کو خدا کا عطیہ سمجھنا چاہئے نہ کہ اپنے عمل کا نتیجہ۔

ان واقعات میں غور کرنے والے کے لئے بے شمار نصیحتیں ہیں۔ ان میں موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح ان میں یہ نشانی ہے کہ جس نے ان کو دیا ہے وہ ان کو چھین بھی سکتا ہے۔ پھر اسی کا ایک نمونہ پانی کا معاملہ ہے۔ پانی کا ذخیرہ سمندروں کی صورت میں ہے جو کہ زیادہ تر کھاری ہیں۔ پانی کا تقریباً ۹۸ فیصد حصہ سمندر میں ہے۔ اور سمندر کے پانی کا ۱/۳ حصہ نمک ہوتا ہے۔ یہ خدا کے قانون کا کرشمہ ہے کہ سمندر سے جب پانی کے بخارات اٹھتے ہیں تو خالص پانی اوپر اڑ جاتا ہے اور نمک نیچے رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارش کا عمل ازالۂ نمک (desalination) کا ایک عظیم آفاقی عمل ہے۔ اگر یہ قدرتی اہتمام نہ ہو تو سارا کا سارا پانی ویسا ہی کھاری ہو جائے جیسا سمندر کا پانی ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف اور دریاؤں میں بہنے والا پانی سب کے سب سخت کھاری ہوں۔ زمین پر پانی کے اتھاہ ذخیروں کے باوجود میٹھے پانی کا حصول انسانیت کے لئے سخت ناقابل حل مسئلہ بن جائے۔ آدمی اگر اس کو سوچے تو اس کا سینہ حمد خداوندی کے جذبہ سے بھر جائے گا۔

57-187

دنیا کی حقیقت

جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ کھیل اور تماشہ ہے اور زینت اور باہمی فخر

اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ جیسے کہ بارش کہ اس کی پیداوار کسانوں کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے۔ پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے معافی اور رضامندی بھی۔ اور دنیا کی زندگی دھوکہ کی پونجی کے سوا اور کچھ نہیں۔ دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ وہ ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اس کو دیتا ہے جسے وہ چاہتا ہے اور اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے (الحدید ۲۰۔۲۱)

دنیا میں اللہ نے آخرت کی مثالیں قائم کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک مثال کھیتی کی ہے۔ کھیتی جب پانی پا کر تیار ہوتی ہے تو تھوڑے دنوں کے لئے اس کی سرسبزی نہایت پرکشش معلوم ہوتی ہے۔ مگر بہت جلد گرم ہوائیں چلتی ہیں۔ ساری سرسبزی اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس کو کاٹ کر اسے چورا چورا کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح موجودہ دنیا کی رونق بھی چند روزہ ہے۔ آدمی اس کو پا کر دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب وہ خدا کی طرف لوٹایا جائے گا تو اس پر کھلے گا کہ دنیا کی رونقوں کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ دنیا محض وقتی ہے، اور آخرت کامل اور دائمی۔

57-188

صحیح ردعمل

کوئی مصیبت نہ زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اس سے پہلے کہ ہم ان کو پیدا کریں، بیشک یہ اللہ کے لئے آسان ہے تاکہ تم غم نہ کرو اس پر جو تم سے کھویا گیا۔ اور نہ اس چیز پر فخر کرو جو اس نے تم کو دیا، اور اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا جو کہ بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور جو شخص اعراض کرے گا تو اللہ بے نیاز ہے خوبیوں والا ہے (الحدید ۲۲۔۲۴)

دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا دونوں امتحان کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مقرر فرمادیا ہے کہ کس شخص کو اس کے امتحان کا پرچہ کن کن صورتوں میں دیا جائے گا۔ آدمی کو اصلاً جس چیز پر توجہ دینا چاہئے وہ یہ نہیں کہ اس کو کیا ملا اور اس سے کیا چھینا گیا بلکہ یہ کہ اس نے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل (response) پیش کیا۔ صحیح اور مطلوب ردعمل یہ ہے کہ آدمی سے کھویا جائے تو وہ دل برداشتہ نہ ہو اور جب اس کو ملے تو وہ اس کی بنا پر فخر و غرور میں مبتلا نہ ہو جائے۔

57-189

حدیدی کردار

ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا زبردست ہے۔ (الحدید ۲۵)

اس دنیا میں صاحب ایمان سے دو چیزیں مطلوب ہیں۔ ایک پیروی دین، اور دوسری حمایت دین۔ ترازو گویا پیرویٔ دین کی علامتی مثال ہے۔ جس طرح ترازو پر کسی چیز کا کم و بیش ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کی کتاب بھی حق کی ترازو ہے، ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے اعمال کو خدا کی کتاب پر جانچ کر دیکھے اور یہ معلوم کرے کہ اس کا عمل کس حد تک درست ہے اور کس حد تک درست نہیں۔

اسی طرح لوہا گویا حمایت دین کی علامتی مثال ہے۔ جب بھی دین کا کوئی معاملہ پڑے تو وہاں آدمی کو لوہے کی طرح مضبوط ثابت ہونا چاہئے۔ اس کو فولادی قوت کے ساتھ دین کا دفاع کرنا چاہئے۔ دین کے معاملہ میں کمزوری دکھانا اپنے ایمان کو خدا کی نظر میں مشتبہ ثابت کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جانچ میں پورا نہیں اترا۔

اس دنیا میں دین کے تقاضے پورا کرنا اسی شخص کے لئے ممکن ہے جو اپنے اندر پختہ کردار کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ حق کا کھلا اعتراف کرنا اپنے آپ کو لوگوں کی

نظر میں حقیر بنانے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ حق کی حمایت میں بولنے میں یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ آدمی اپنے گروہ سے کٹ جائے گا۔ حق کا ساتھ دینا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مفادات کی پروانہ کرے۔ حق کی جانب کھڑے ہونے میں آدمی تنہا ہو جاتا ہے اور حق کی جانب کھڑے نہ ہونے میں اس کو امید ہوتی ہے کہ عوام کی بھیڑ اس کا ساتھ دے گی۔ حق کی حمایت کرنے میں زندگی کا نقشہ بگڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور حق کی حمایت نہ کرنے میں یہ امید ہوتی ہے کہ زندگی کے تمام معاملات درست رہیں گے۔

حدید (لوہا) اس دنیا میں استحکام کی علامت ہے۔ لوہا اس بات کا عملی سبق ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ زندگی کے امتحان میں لوہے کی طرح مستحکم رہے، وہ حدیدی کردار کے ساتھ خدا کے دین کا حامی بنا رہے۔

58-190

خدا کی نگرانی

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی نہیں ہوتی جس میں چوتھا اللہ نہ ہو۔ اور نہ پانچ کی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو۔ اور نہ اس سے کم کی اور نہ اس سے زیادہ کی۔ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر وہ ان کو ان کے کئے سے آگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے (المجادلہ ۸)

کائنات اپنے انتہائی پیچیدہ نظام کے ساتھ یہ گواہی دے رہی ہے کہ وہ ہر آن کسی بالاتر طاقت کی نگرانی میں ہے۔ اگر یہ مسلسل نگرانی نہ ہو تو دنیا اپنی موجودہ بامعنیٰ حیثیت میں باقی نہ رہے۔ کائنات میں نگرانی کی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ انسان بھی مسلسل طور پر اپنے خالق کی نگرانی میں ہے۔ جب بقیہ کائنات خالق کی زیر نگرانی ہے تو انسان اپنے خالق کے زیر نگرانی کیوں نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں حق کے خلاف خفیہ سرگرمیاں دکھانا صرف ایسے اندھے لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو خدا سے بے خوف ہوں، وہ خدا کی صفتوں کو نہ براہ راست طور پر ملفوظ قرآن میں پڑھ سکیں اور نہ

بالواسطہ طور پر غیر ملفوظ کائنات میں۔

"میں خدا کی نگرانی میں ہوں" یہ یقین آدمی کو آخری حد تک چوکنا بنا دیتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر وہ خود اپنا احتساب نہ کرے تو خداوند عالم اس کا احتساب کرے گا، اور پھر خدا کی پکڑ سے بچنا میرے لئے کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

59-191

ایمانی بلندی

اور جو لوگ پہلے سے دار الاسلام (مدینہ) میں قرار پکڑے ہوئے ہیں اور ایمان استوار کئے ہیں، جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے وہ محبت کرتے ہیں اور وہ اپنے دلوں میں اس سے تنگی نہیں پاتے جو مہاجرین کو دیا جاتا ہے۔ اور وہ ان کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں۔ اگر چہ ان کے اوپر فاقہ ہو۔ اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچالیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو ان کے بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لئے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب، تو بڑا شفیق اور مہربان ہے۔ (الحشر ۹۔۱۰)

ہجرت کے نتیجے میں جو مسلمان بے وطن ہوئے اور مکہ کو چھوڑ کر مدینہ پہنچے، ان کا مدینہ آنا مدینہ کے مقامی مسلمانوں (انصار) پر ایک بوجھ تھا۔ مگر انہوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب اموال آئے تو آپ نے سارا مال مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا۔ اور انصار کو کچھ نہیں دیا۔ اس پر بھی انصار مدینہ کے اندر ان کے خلاف کوئی رنجش پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی وہ ان مہاجر مسلمانوں کے اتنے زیادہ قدرداں رہے کہ ان کے حق میں ان کے دل سے بہتر دعائیں نکلتی رہیں ـــــ یہی وہ عالی حوصلگی ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ بناتی ہے۔

ہجرت کے بعد مدینہ میں جو حالات پیدا ہوئے وہ دونوں کے لئے امتحان تھے۔ وہ یہ کہ

اختلاف کے باوجود دونوں مسلم گروہ آپس میں متحد رہیں۔ معاشی مسائل کے باوجود ان کی فراخ دلی متاثر نہ ہو۔ مشکلات کے باوجود ان کے اخلاص میں کوئی فرق نہ آئے۔ مفادات کے ٹکراؤ کے باوجود ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ بنا رہے۔ اپنی قربانی کی مادی قیمت نہ ملنے کے باوجود ان کے اندر منفی جذبات نہ ہوں۔ دولت اور عہدہ کی تقسیم میں امتیاز کے باوجود ان کی دینی یکسوئی میں فرق نہ آئے۔ دنیوی نوعیت کے تلخ تجربات کے باوجود ان کا سینہ شکایت اور نفرت سے خالی رہے۔

59-192

عقل کا نتیجہ

بے شک تم لوگوں کا ڈر ان کے دلوں میں اللہ سے زیادہ ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ یہ لوگ سب مل کر تم سے کبھی نہیں لڑیں گے۔ مگر حفاظت والی بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ میں۔ ان کی لڑائی آپس میں سخت ہے۔ تم ان کو متحد خیال کرتے ہو اور ان کے دل جدا جدا ہو رہے ہیں۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ عقل نہیں رکھتے۔ (الحشر ۱۳۔۱۴)

خدا کی طاقت بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ مگر انسانوں کی طاقت کھلی آنکھ سے نظر آتی ہے۔ اس بنا پر ظاہر پرست لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے تو بے خوف رہتے ہیں۔ مگر انسانوں میں اگر کوئی زور آور دکھائی دے تو وہ فوراً اس سے ڈرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ خدا کے بارہ میں ان کی بے شعوری انہیں ان کی دنیا کے بارہ میں بھی بے شعور بنا دیتی ہے۔

ایسے لوگ جن کو صرف منفی مقصد نے متحد کیا ہو وہ زیادہ دیر تک اپنا اتحاد باقی نہیں رکھ پاتے کیوں کہ دیرپا اتحاد کے لئے مثبت بنیاد درکار ہے اور وہ ان کے پاس موجود ہی نہیں۔

ان آیتوں میں خدا سے خوف کو بھی عقل کا نتیجہ بتایا گیا ہے اور باہمی اتحاد کو بھی عقل کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہیات اور انسانیات دونوں ہی کی درستی عقل و فہم کے اوپر منحصر ہے۔ کوئی فرد یا گروہ عقلی اعتبار سے جتنا زیادہ باشعور ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی زندگی کے معاملات درست ہوں گے، خدا کی نسبت سے بھی اور انسانوں کی نسبت سے بھی۔

59-193

انسان کا مستقبل

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل کے لئے کیا بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ نافرمان ہیں۔ دوزخ والے اور جنت والے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔ (الحشر ۱۸۔۲۰)

انسانی زندگی کو "آج" اور "کل" کے درمیان تقسیم کیا گیا ہے۔ موجودہ دنیا انسان کا آج ہے اور آخرت کی دنیا اس کا کل ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں جو کچھ کرے گا اس کا لازمی انجام اس کو آنے والی طویل تر زندگی میں بھگتنا پڑے گا۔

یہی اصل حقیقت ہے اور اسی حقیقت کا دوسرا نام اسلام ہے۔ انسان کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس حقیقت واقعی کو ہمیشہ ذہن میں رکھے۔ جو شخص اس حقیقت واقعی سے غافل ہو جائے اس کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جائے گی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا کوئی فرق نہیں۔ مسلمانوں کو اس کا فائدہ اسی وقت ملے گا جب کہ واقعۃً وہ اس پر قائم ہوں۔ مسلمان اگر غفلت میں پڑ جائیں تو ان کا انجام بھی وہی ہو گا جو اس سے پہلے غفلت میں پڑنے والے یہود کا ہوا۔

آخرت میں کامیاب انسانوں اور ناکام انسانوں کی تفریق کی جائے گی۔ ایک گروہ کے لئے جنت ہو گی اور دوسرے گروہ کے لئے جہنم۔ یہ تقسیم نسلی یا گروہی بنیاد پر نہیں ہو گی۔ وہ تمام تر حقیقت کی بنیاد پر ہو گی۔ ہر آدمی کا مستقبل اس کے ذاتی وصف (merit) کی بنیاد پر طے کیا جائے گا، نہ کہ کسی اور مفروضہ بنیاد پر۔

59-194

خدا اور کائنات

اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ

جاتا، اور یہ مثالیں ہم لوگوں کو لئے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سوچیں۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا، وہ بڑا مہربان ہے۔ نہایت رحم والا ہے۔ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، سب عیبوں سے پاک، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبان، غالب، زور آور، عظمت والا، اللہ اس شرک سے پاک ہے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہی اللہ ہے پیدا کرنے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا، اسی کے لئے ہیں سارے اچھے نام۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کر رہی ہے۔ اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ (الحشر ۲۱۔ ۲۴)

قرآن اس عظیم حقیقت کا اعلان ہے کہ انسان آزاد نہیں ہے بلکہ اس کو اپنے تمام اعمال کی جواب دہی اللہ کے سامنے کرنی ہے جو انتہائی طاقت ور ہے۔ وہ ہر ایک کے اعمال کو بذات خود پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ خبر اتنی سنگین ہے کہ پہاڑ تک کو لرزا دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر انسان اتنا غافل اور بے حس ہے کہ وہ اس ہولناک خبر کو سن کر بھی نہیں تڑپتا۔

اللہ کے اسماء جو یہاں بیان کئے گئے ہیں وہ ایک طرف اللہ کی ذات کا تعارف ہیں۔ دوسری طرف وہ بتاتے ہیں کہ وہ ہستی کیسی عظیم ہستی ہے جو انسانوں کی خالق ہے اور ان کے اوپر ان کی نگرانی کر رہی ہے۔ اگر آدمی کو واقعۃً اس کا احساس ہو جائے تو وہ اللہ کی حمد و تسبیح میں سراپا غرق ہو جائے گا۔

کائنات اپنی تخلیقی معنویت کی صورت میں خدا کی صفات کا آئینہ ہے۔ وہ خود حمد و تسبیح میں مصروف ہو کر انسان کو بھی حمد و تسبیح کا سبق دیتی ہے۔

60-195

اخلاقی حدود

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے نہیں روکتا جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی۔ اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے بھلائی کرو اور تم ان کے ساتھ انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ بس ان لوگوں سے تم کو منع کرتا ہے جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ اور تمہارے نکالنے میں مدد

کی کہ تم ان سے دوستی کرو، اور جو ان سے دوستی کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ (الممتحنہ ۸۔۹)

جہاں تک عدل و انصاف کا تعلق ہے وہ ہر ایک سے کیا جائے گا، خواہ فریق ثانی دشمن ہو یا غیر دشمن۔ عدل سے انحراف کسی بھی حال میں جائز نہیں۔ مگر دوستی کا تعلق ہر ایک سے درست نہیں۔ دوستی صرف اسی کے ساتھ جائز ہے جو اللہ کا دوست ہو یا کم از کم یہ کہ وہ اللہ کا دشمن نہ ہو۔

61-196

کامیاب تجارت

اے ایمان والو، کیا میں تم کو ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنے جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کردے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے، یہ ہے بڑی کامیابی اور ایک اور چیز بھی جس کی تم تمنار کھتے ہو، اللہ کی مدد اور فتح جلدی، اور مومنوں کو بشارت دے دو۔ (الصف ۱۰۔۱۳)

تجارت میں آدمی پہلے دیتا ہے، اس کے بعد اس کو واپس ملتا ہے، دین کی جدو جہد میں بھی آدمی کو اپنی قوت اور اپنا مال دینا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی ایک قسم کی تجارت ہے۔ البتہ دنیوی تجارت کا نفع صرف دنیا میں ملتا ہے اور دین کی تجارت کا نفع مزید اضافہ کے ساتھ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ پھر اسی "تجارت" سے اہل اسلام کے غلبہ کی راہ بھی کھلتی ہے جو موجودہ دنیا میں کسی گروہ کو باعزت زندگی حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

62-197

جمعہ کا دن

اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز پوری ہو جائے تو

زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشہ دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، کہو کہ جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ (الجمعہ ۹۔۱۱)

دنیا میں آدمی بیک وقت دو تقاضوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک معاش کا تقاضا اور دوسرے دین کا تقاضا۔ ان میں سے ہر تقاضا ضروری ہے۔ البتہ ان کے درمیان اس طرح تقسیم ہونی چاہئے کہ معاشی سرگرمیاں دینی تقاضے کے ماتحت ہوں۔ آدمی کو اجازت ہے کہ وہ جائز حدود میں معاش کے لئے دوڑ دھوپ کرے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ اس کو جو معاشی کامیابی حاصل ہو اس کو وہ سراسر اللہ کا فضل سمجھے۔ نیز معاشی سرگرمی کے دوران برابر اللہ کو یاد کرتا رہے۔ اسی کے ساتھ اس کو ہمیشہ تیار رہنا چاہئے کہ جب بھی دین کے کسی تقاضے کے لئے پکارا جائے تو اس وقت وہ ہر دوسرے کام کو چھوڑ کر دین کے کام کی طرف دوڑ پڑے۔

قرآن کی ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا دن اسلام کے نقشۂ حیات میں، کاروباری اور دفتری چھٹی کا دن نہیں ہے، کیوں کہ اس آیت کے مطابق مسلمان جمعہ کے دن اپنے کاروبار میں مشغول رہیں گے اور صرف اس وقت کچھ دیر کے لئے اپنا کاروبار بند کریں گے جب کہ مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہو، اذان کے بعد وہ وقتی طور پر مسجد میں آئیں گے اور نماز کی ادائیگی کے بعد وہ دوبارہ اپنے کاروباری مشاغل کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ ہفتہ کی چھٹی کا مسئلہ کوئی دینی مسئلہ نہیں وہ ایک دنیوی مسئلہ ہے۔ اور حدیث: انتم اعلم بامور دنیاکم (صحیح مسلم) کے مطابق، اس کا فیصلہ دنیوی مصلحت کی بنیاد پر کیا جائے گا نہ کہ شرعی مسئلہ کی بنیاد پر۔

63-198

منافقانہ روش

جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک

اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، پھر وہ روکتے ہیں اللہ کی راہ سے، بے شک نہایت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ وہ ایمان لائے پھر انہوں نے کفر کیا، پھر ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی۔ پس وہ نہیں سمجھتے۔ (المنٰفقون ۱۔۳)

یہ کسی آدمی کے نفاق کی علامت ہے کہ وہ بڑی بڑی باتیں کرے۔ اور قسم کھا کر اپنی بات کا یقین دلائے۔ مخلص آدمی اللہ کے خوف سے دبا ہوا ہوتا ہے۔ وہ زبان سے زیادہ دل سے بولتا ہے۔ منافق آدمی صرف انسان کو اپنی آواز سنانے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور مخلص آدمی خدا کو سنانے کا۔

جب ایک شخص ایمان لاتا ہے تو وہ ایک سنجیدہ عہد کرتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کے عملی مواقع آتے ہیں، جہاں ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس عہد کے مطابق عمل کرے۔ اب جو شخص ایسے مواقع پر اپنے دل کی آواز کو سن کر عہد کے تقاضے پورے کرے گا۔ اس نے اپنے عہد ایمان کو پختہ کیا۔ اس کے برعکس جس کا یہ حال ہو کہ اس کے دل نے آواز دی مگر اس نے دل کی آواز کو نظر انداز کر کے عہد کے خلاف عمل کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دھیرے دھیرے اپنے عہد ایمان کے معاملہ میں بے حس ہو جائے گا۔۔۔۔۔ یہی مطلب ہے دل پر مہر لگنے کا۔

63-199

منافقانہ روش

اور جب تم ان منافقین کو دیکھو تو ان کے جسم تم کو اچھے لگتے ہیں، اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات سنتے ہو، گویا کہ وہ لکڑیاں ہیں ٹیک لگائی ہوئی۔ وہ ہر زور کی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ دشمن ہیں، پس ان سے بچو۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کہاں پھرے جاتے ہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمہارے لئے استغفار کرے تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں۔ اور تم ان کو دیکھو گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے بے رخی کرتے ہیں۔ ان کے لئے یکساں ہے، تم ان کے لئے مغفرت کی دعا کرو یا مغفرت کی دعا نہ کرو، اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا۔ اللہ نافرمان

لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا (المنفقون ۴۔۶)

منافق آدمی مصلحت پرستی کے ذریعہ اپنے مفادات کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ حق ناحق کی بحث میں نہیں پڑتا، اس لئے ہر ایک سے اس کا بناؤ رہتا ہے۔ اس کی زندگی درد اور غم سے خالی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں اس کے جسم کو فربہ بنا دیتی ہیں۔ وہ لوگوں کے مزاج کی رعایت کر کے بولتا ہے۔ اس لئے اس کی باتوں میں ہر ایک اپنے لئے دل چسپی کا سامان پالیتا ہے۔ مگر یہ بظاہر ہرے بھرے درخت حقیقۃً صرف سوکھی لکڑی کے مانند ہوتے ہیں جن میں کوئی زندگی نہ ہو۔ وہ اندر سے بزدل ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا دنیوی مفاد ہر دینی مفاد سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ وہ حق اور ناحق کے معاملہ میں کبھی جرأت مندانہ موقف اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہیں تاکہ وہ ہر ایک کی نظر میں اچھے بنے رہیں۔ ایسے لوگ ایمان کے بلند بانگ مدعی ہونے کے باوجود خدا کی ہدایت سے یکسر محروم ہیں۔

منافقانہ روش حقیقۃً مصالحانہ روش (compromising behavior) کا دوسرا نام ہے۔ منافق انسان ایک طرف اسلام کے ظاہری اعمال کو اختیار کئے ہوئے ہوتا ہے۔ تاکہ وہ اہل اسلام کو مومن و مسلم دکھائی دے۔ دوسری طرف وہ اہل دنیا کے ساتھ ہمیشہ اس طرح معاملہ کرتا ہے کہ وہ ان کی نظر میں اچھا بنا رہے۔ اور کسی سے بھی اس کا ٹکراؤ نہ پیش آئے۔ منافق انسان خدا اور رسول کا نام لیتا ہے مگر اس کا مذہب خدا پرستی نہیں ہوتا۔ اس کا حقیقی مذہب مفاد پرستی ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیوں کا مرکز صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا شخصی مفاد محفوظ رہے۔ دنیا والوں کے درمیان اس کو ہمیشہ عزت کا مقام حاصل رہے۔

63-200

مال اور اولاد

اے ایمان والو، تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔ اور جو ایسا کرے گا تو وہی گھاٹے میں پڑنے والے لوگ ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں

سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں کسی کی موت آجائے۔ پھر وہ کہے کہ اے میرے رب، تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا۔ اور اللہ ہرگز کسی جان کو مہلت نہیں دیتا جب کہ اس کی میعاد آجائے، اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو (المنفقون ۹۔۱۱)

ہر آدمی کے لئے سب سے بڑا مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ مگر مال اور اولاد انسان کو اس سب سے بڑے مسئلے سے غافل کر دیتے ہیں۔ انسان کو جاننا چاہئے کہ مال اور اولاد مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہیں۔ وہ اس لئے کسی کو دئے جاتے ہیں کہ وہ ان کو اللہ کے کام میں لگائے۔ وہ ان کو اپنی آخرت بنانے میں استعمال کرے۔ مگر نادان آدمی ان کو بذاتِ خود مقصود سمجھ لیتا ہے۔ ایسے لوگ جب اپنے آخری انجام کو پہنچیں گے تو وہاں ان کے لئے حسرت وافسوس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

دنیا میں مال اور اولاد اور اس قسم کی دوسری مادی چیزیں جو انسان کو دی گئی ہیں وہ اس کے لئے انعام نہیں ہیں بلکہ وہ اس کے لئے آزمائش ہیں۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی ان چیزوں کو پاکر اپنے لئے ایک پر راحت زندگی بنائے اور اس میں خوش رہے۔ بلکہ ان میں سے ہر چیز انسان کے لئے امتحان کا پرچہ ہے۔ ان کے ذریعہ انسان کو جانچا جا رہا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ ان چیزوں کو اپنے لئے آزمائش سمجھے نہ کہ نعمت۔ نعمت تو آخرت میں ملے گی۔ موجودہ دنیا جانچنے کی جگہ ہے۔ اور آخرت اس جانچ کے مطابق انعام یا سزا پانے کی جگہ ہے۔

64-201

تسبیح کائنات

اللہ کی تسبیح کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر چیز جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن، اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا اور اس نے تمہاری صورت بنائی تو نہایت اچھی صورت بنائی۔ اور اسی کی طرف ہے لوٹنا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ اور وہ جانتا ہے جو تم

چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔ اور اللہ دلوں تک کی باتوں کا جاننے والا ہے (التغابن ۱۔۴)

"کائنات اللہ کی تسبیح کر رہی ہے" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس حقیقت کو قرآن میں کھولا ہے۔ کائنات سراپا اس کی تصدیق بنی ہوئی ہے، وہ زبان حال سے حمد و ستائش کی حد تک اس کی تائید کر رہی ہے۔ اس دو طرفہ اعلان کے باوجود جو لوگ مومن نہ بنیں، اس کے بعد انہیں تیسرے اعلان کا انتظار کرنا چاہئے جب کہ تمام لوگ خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے تاکہ خود مالک کائنات کی زبان سے اپنے بارہ میں آخری فیصلہ کو سنیں۔

انسان کے سوا اس دنیا میں جو چیزیں ہیں، ان میں مومن اور منکر کی تقسیم نہیں۔ یہاں تمام چیزیں اقرار و ایمان کی سطح پر جی رہی ہیں۔ یہ صرف انسان کی دنیا ہے جہاں یہ تقسیم دکھائی دیتی ہے۔ یہ تقسیم اس لیے ہے کہ انسان کو قول و عمل کی آزادی دی گئی ہے۔ تاہم یہ آزادی انسان کا حق نہیں۔ اس آزادی کے باوجود انسان کو وہی کرنا ہے جو بقیہ کائنات کر رہی ہے۔ جو لوگ ایسا نہ کریں وہ زندگی کے اگلے دور میں سخت عذاب کے مستحق قرار پائیں گے۔

64-202

ہار اور جیت

انکار کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے نہ جائیں گے، کہو کہ ہاں، میرے رب کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہے، اور یہ اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔ پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس کے نور پر جو ہم نے اتارا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ جس دن وہ تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا۔ یہی دن ہار جیت کا دن ہوگا، اور جو شخص اللہ پر ایمان لایا ہوگا اور اس نے نیک عمل کیا ہوگا، اللہ اس کے گناہ اس سے دور کر دے گا اور اس کو باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی، اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی آگ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور وہ برا ٹھکانا ہے (التغابن ۷۔۱۰)

لوگ دنیا کو ہار جیت (التغابن) کی جگہ سمجھتے ہیں۔ کسی شخص کو یہاں کامیابی مل جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اور جو شخص یہاں ناکامی سے دوچار ہو وہ لوگوں کی نظر میں حقیر بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہار بھی بے قیمت ہے اور یہاں کی جیت بھی بے قیمت۔

ہار جیت کا اصل مقام آخرت ہے۔ ہارنے والا وہ ہے جو آخرت میں ہارے اور جیتنے والا وہ ہے جو آخرت میں جیتے۔ اور وہاں کی ہار جیت کا معیار بالکل مختلف ہے۔ دنیا میں ہار جیت ظاہری مادیات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اور آخرت کی ہار جیت خدائی اخلاقیات کی بنیاد پر ہوگی۔ اس وقت دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ یہاں سارا معاملہ بالکل بدل گیا ہے۔ جس پانے کو لوگ پانا سمجھ رہے تھے وہ دراصل کھونا تھا۔ اور جس کھونے کو لوگوں نے کھونا سمجھ رکھا تھا وہی در اصل وہ چیز تھی جس کو پانا کہا جائے۔ اسی دن کی ہار ہار ہے اور اسی دن کی جیت جیت۔

دنیا بھی ہار اور جیت کا میدان ہے اور آخرت بھی ہار اور جیت کا میدان۔ مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ دنیا کی ہار اور جیت دونوں صرف وقتی ہیں۔ جب کہ آخرت کی ہار اور جیت دونوں ابدی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ کامل بھی۔

64-203

مصیبت کیوں

جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ اور جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو راہ دکھاتا ہے، اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر تم اعراض کرو گے تو ہمارے رسول پر بس صاف صاف پہنچا دینا ہے۔ اللہ، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور ایمان لانے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے (التغابن ۱۱۔ ۱۳)

کوئی مصیبت اپنے آپ نہیں آتی، ہر مصیبت خدا کی طرف سے آتی ہے، اور اس لئے آتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسان کو ہدایت عطا کی جائے۔ مصیبت آدمی کے دل کو نرم کرتی ہے۔ اور اس کی سوئی ہوئی نفسیات میں ہلچل پیدا کرتی ہے۔ مصیبت کے جھٹکے آدمی کے ذہن کو جگانے کا کام کرتے ہیں۔

اگر آدمی اپنے آپ کو منفی ردعمل سے بچائے تو مصیبت اس کے لئے بہترین ربانی معلم بن جائے گی۔

65-204

نکاح وطلاق

اے پیغمبر، جب تم لوگ عورتوں کو طلاق دو تو ان کی مدت پر طلاق دو اور مدت گنتے رہو، اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے۔ ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، الا یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کریں، اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو شخص اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا، تم نہیں جانتے شاید اللہ اس طلاق کے بعد کوئی نئی صورت پیدا کردے۔ پھر جب وہ اپنے مدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو معروف کے مطابق رکھ لو یا معروف کے مطابق ان کو چھوڑ دو اور اپنے میں سے دو معتبر گواہ کرلو اور ٹھیک ٹھیک اللہ کے لئے گواہی دو۔ یہ اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کے لئے راہ نکالے گا، اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں اس کا گمان بھی نہ گیا ہو، اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔ (الطلاق ۱-۳)

اسلام میں نکاح کی اصل نباہ ہے۔ تاہم استثنائی طور پر اسلام میں طلاق کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ اسلامی طلاق کا ایک مقرر طریق کار ہے جو خاص وقفہ کے درمیان پورا ہوتا ہے۔ اس طرح طلاق کے عمل کو کچھ حدود کا پابند کر دیا گیا ہے۔ ان حدود کا مقصد یہ ہے کہ فریقین کے درمیان آخر وقت تک واپسی کا موقع باقی رہے۔ اور طلاق کا واقعہ کسی قسم کے خاندانی یا سماجی فساد کا ذریعہ نہ بنے، وہی طلاق اسلامی طلاق ہے جس کے پورے عمل کے دوران خدا کے خوف کی روح جاری وساری رہے۔

سرکشی اور انانیت کے تحت دیا ہوا طلاق جائز اسلامی طلاق نہیں۔ ایسا طلاق خواہ قانونی طور پر واقع ہو جائے، وہ ایسے شخص کو خدا کی نظر میں مجرم ثابت کرتا ہے۔ جس کی سزا سے وہ بچ نہیں سکتا، الا یہ کہ وہ تائب ہو اور وہ اپنے جرم کی تلافی کرے۔

65-205

خاندانی زندگی

تم ان عورتوں کو اپنی وسعت کے مطابق رہنے کا مکان دو جہاں تم رہتے ہو اور ان کو تنگ کرنے کے لئے انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ، اور اگر وہ حمل والیاں ہوں تو ان پر خرچ کرو یہاں تک کہ ان کا وضع حمل ہو جائے۔ پھر اگر وہ تمہارے لئے دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کو نیکی سکھاؤ۔ اور اگر تم آپس میں ضد کرو تو کوئی اور عورت دودھ پلائے گی۔ چاہئے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہئے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ اللہ کسی پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اتنا ہی جتنا اس کو دیا ہے، اللہ سختی کے بعد جلد ہی آسانی پیدا کر دے گا (الطلاق ٦۔٧)

اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ آدمی معاملات میں فریق ثانی کے ساتھ فراخ دلی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ صبر کے ساتھ خلاف مزاج باتوں کو سہے۔ ناگواریوں کے باوجود دوسرے کا حق ادا کرے۔ جب آدمی ایسا کرتا ہے تو وہ صرف فریق ثانی کے لئے اچھا نہیں کرتا بلکہ خود اپنے لئے بھی اچھا کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کرتا ہے اور حقیقت پسندی کا مزاج بلاشبہ اس دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا زینہ ہے۔

گھر کی زندگی باہر کی سماجی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ گھر کے اندر وہ سب کچھ چھوٹے پیمانہ پر پیش آتا ہے جو باہر کی سماجی زندگی میں زیادہ بڑے پیمانہ پر پیش آتا ہے۔ اس اعتبار سے گھر گویا ایک تربیت گاہ ہے۔ جو آدمی اپنے گھر کی زندگی میں صحیح انسان ثابت ہو وہ یقینی طور پر وسیع تر سماجی زندگی میں بھی صحیح انسان ثابت ہو گا۔

66-206

عذاب سے نجات

اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی

اور پتھر ہوں گے۔ اس پر تند خو اور زبردست فرشتے مقرر ہیں۔ اللہ ان کو جو حکم دے اس میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ اور وہ وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم ملتا ہے۔ اے لوگوں جنہوں نے انکار کیا، آج عذر نہ پیش کرو، تم وہی بدلہ میں پا رہے ہو جو تم کرتے تھے۔ (التحریم ۶۔۷)

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک چیز کو حق سمجھتا ہے، مگر بیوی بچوں سے بڑھا ہوا تعلق اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ حق کے طریقہ کو چھوڑ دے اور وہی کرے جو اس کے بیوی بچے چاہتے ہیں۔ مگر یہ زبردست بھول ہے۔ انسان کو یاد رکھنا چاہئے کہ آج جن بچوں کی رعایت کرنے میں وہ اس حد تک جاتا ہے کہ حق کی رعایت کرنا بھول جاتا ہے، وہ بچے اپنی اس روش کے نتیجے میں کل ایسے جہنمی کارندوں کے حوالے کئے جائیں گے جو مشینی انسان (Robot) کی طرح بے رحم ہوں گے اور ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

حق مکمل طور پر واضح ہے۔ انسان کی فطرت اور خدا کی وحی دونوں اس کی صداقت کا غیر مبہم اعلان کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کا کوئی بھی عذر قابل لحاظ نہیں۔ دنیا میں جھوٹے عذرات (excuses) کی بنا پر انسان حق سے انحراف کرتا ہے۔ مگر آخرت میں اس پر کھل جائے گا کہ اس کا کیس سرکشی کا کیس تھا نہ کہ عذر کا کیس۔

66-207

آخرت کی روشنی

اے ایمان والو، اللہ کے آگے سچی توبہ کرو۔ امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ جس دن اللہ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دائیں طرف دوڑ رہی ہو گی۔ وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہماری روشنی کو کامل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے (التحریم ۸)

موجودہ دنیا میں انسان کو آزمائشی حالات میں رکھا گیا ہے۔ اس لئے انسان سے غلطیاں

بھی ہوتی ہیں۔ اس کی تلافی کے لئے توبہ ہے۔ یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنا۔ توبہ کی اصل حقیقت شرمندگی ہے۔ آدمی کو اگر واقعۃً اپنی غلطی کا احساس ہو تو وہ سخت شرمندہ ہوگا اور اس کی شرمندگی اس کو مجبور کرے گی کہ وہ آئندہ ایسا فعل نہ کرے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ شرمندگی ہی توبہ ہے (الندم توبة)۔ ایک صحابی نے کہا کہ سچی توبہ یہ ہے کہ آدمی رجوع کرے اور پھر اس فعل کو نہ دہرائے (يتوب ثم لا يعود)۔

توبہ وہ ہے جو سچی توبہ (توبة النصوح) ہو۔ محض الفاظ دہرا دینے کا نام توبہ نہیں۔ حضرت علی نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی کسی غلطی کے بعد زبان سے توبہ توبہ کہہ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جھوٹے لوگوں کی توبہ (توبة الكاذبين) ہے — سچی توبہ آخرت کی روشنی ہے اور جھوٹی توبہ آخرت کا اندھیرا۔

67-208

انسان اور بقیہ کائنات

بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے، اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے، تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی نقص نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو، نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی۔ (الملک ۱۔۴)

جب ایک شخص موجودہ دنیا کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کو یہاں ایک تضاد نظر آتا ہے۔ انسان کے سوا جو بقیہ کائنات ہے وہ انتہائی حد تک منظم اور کامل ہے۔ اس میں کہیں بھی کوئی نقص نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس انسانی زندگی میں ظلم وفساد دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ انسان کی علیحدہ نوعیت ہے۔ انسان اس دنیا میں حالت امتحان میں ہے۔ امتحان لازمی طور پر عمل کی آزادی چاہتا ہے۔ اسی عمل کی آزادی نے انسان کو یہ موقع دیا کہ وہ دنیا میں ظلم وفساد کر سکے۔

انسانی دنیا کا ظلم انسانی آزادی کی قیمت ہے۔ اگر یہ حالات نہ ہوں تو ان قیمتی انسانوں کا انتخاب کیسے کیا جائے گا۔ جنہوں نے ظلم کے مواقع پاتے ہوئے ظلم نہیں کیا۔ جنہوں نے سرکشی کی طاقت رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو سرکشی سے بچائے رکھا۔

67-209

صحیح رائے قائم کرنا

کیا جو شخص اوندھے منھ چل رہا ہے وہ زیادہ صحیح راہ پانے والا ہے یا وہ شخص جو سیدھا ایک صراط مستقیم پر چل رہا ہے۔ کہو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل بنائے۔ تم لوگ بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ کہو کہ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا اور تم اسی کی طرف اکٹھا کئے جاؤ گے۔ (الملک ۲۲۔۲۴)

انسان کو سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ اب کوئی انسان وہ ہے کہ جو کچھ اس نے سنا اسی پر چل پڑا۔ جو دیکھا اس کو بس اس کے ظاہر کے اعتبار سے مان لیا۔ جو بات ایک بار ذہن میں آگئی اسی پر جم گیا۔ یہ انسان وہ ہے جو جانوروں کی طرح سر جھکائے ہوئے بس ایک ڈگر پر چلا جا رہا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو سنی ہوئی بات کی تحقیق کرے۔ جو دیکھی ہوئی بات کو یقینی صحت کے ساتھ جاننے کی کوشش کرے۔ جو اپنے ذاتی خول سے باہر نکل کر سچائی کو دریافت کرے۔ یہ دوسرا انسان وہ ہے جو سیدھا ہو کر ایک ہموار راستے پر چلا جا رہا ہے ــــ سمع و بصر و فواد کی صلاحیت آدمی کو اس لئے دی گئی ہے کہ وہ حق کو پہچانے، نہ یہ کہ وہ اندھے بہرے کی طرح اس سے بے خبر رہے۔

68-210

اعلیٰ اخلاق

ن، قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لوگ لکھتے ہیں۔ تم اپنے رب کے فضل سے دیوانے نہیں ہو۔ اور بے شک تمہارے لئے اجر ہے کبھی ختم نہ ہونے والا۔ اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر

ہو۔ پس عنقریب تم دیکھو گے اور وہ بھی دیکھیں گے، کہ تم میں سے کس کو جنون تھا۔ تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے، جو اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے۔ اور وہ راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے (القلم ۱-۷)

اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی، بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے۔ خواہ دوسرے اس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق یہی دوسرا اخلاق تھا۔ اس قسم کا اخلاق ثابت کرتا ہے کہ آپ ایک بااصول انسان تھے۔ آپ کی شخصیت حالات کی پیداوار نہ تھی۔ بلکہ خود اپنے اعلیٰ اصولوں کی پیداوار تھی۔ آپ کا یہ اعلیٰ اخلاق آپ کے اس دعوہ کے عین مطابق ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔

والقلم وما یسطرون سے مراد تاریخی ریکارڈ ہے۔ تاریخ کی شکل میں انسانی یادداشت کا جو ریکارڈ جمع ہوا ہے اس میں قرآن ایک استثنائی کتاب ہے۔ اور صاحب قرآن ایک استثنائی شخصیت۔ اس استثناء کی اس کے سوا اور کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی کہ قرآن کو خدا کی کتاب مانا جائے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا پیغمبر۔ کیوں کہ قرآن کا استثنائی طور پر پوری طرح محفوظ رہنا اور پیغمبر کی تعلیمات کا استثنائی طور پر ہر تاریخی جانچ پر پورا اترنا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ انہیں خدا کی خصوصی تائید حاصل ہو۔

69-211

پیغمبر کی صداقت

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور جن کو تم نہیں دیکھتے ہو۔ بے شک یہ ایک باعزت رسول کا کلام ہے۔ اور وہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا کلام نہیں۔ تم بہت کم غور کرتے ہو۔ خداوند کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر وہ کوئی بات گھڑ کر ہمارے اوپر لگاتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑتے۔ پھر ہم اس کی رگ دل کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی اس سے ہم کو روکنے والا نہ ہوتا۔ اور بلاشبہ یہ یاددہانی ہے ڈر

والوں کے لئے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ منکروں کے لئے پچھتاوا ہے۔ اور یہ یقینی حق ہے۔ پس تم اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ (الحاقۃ ۳۸۔ ۵۲)

جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو کچھ تم نہیں دیکھتے سب اس کلام کی صداقت پر گواہ ہے ــــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو معلومات انسان کی دسترس میں آچکی تھیں اور جو بعد کے زمانہ میں اس کی دسترس میں آنے والی تھیں، دونوں اس کلام کی حقانیت ثابت کرنے والی ہیں۔ اس کالم کے برحق ہونے کی تردید نہ حال کا علم کر رہا ہے اور نہ مستقبل کا علم اس کی تردید کر سکے گا۔ اس کے باوجود جو لوگ اس کو نہ مانیں وہ اپنے بارہ میں صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ حق اور ناحق کے معاملہ میں سنجیدہ نہیں۔

"اگر وہ کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو پکڑتے اور اس کو کاٹ ڈالتے" ــــــ اس ارشاد الٰہی سے ایک اہم حقیقت مستنبط ہوتی ہے وہ یہ کہ رسول خدا ہونے کا دعویٰ کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ یہ بے حد سنگین بات ہے۔ اس دنیا میں کسی غیر پیغمبر کو خدا یہ موقع دینے والا نہیں کہ وہ اپنی زبان سے اس قسم کا غیر معمولی اعلان کرے۔ حتی کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں خدا نے انسان کو فطری طور پر اتنا زیادہ دہشت زدہ کر رکھا ہے کہ پوری تاریخ میں کوئی بھی غیر پیغمبر یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکا کہ "میں خدا کا پیغمبر ہوں"۔

70-212

جنت کے باشندے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ سرکش لوگ آخرت میں آگ کے عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے: مگر وہ نمازی جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ اور جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا معین حق ہے۔ اور جو انصاف کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک ان کے رب کے عذاب سے کسی کو نڈر نہ ہونا چاہئے۔ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ــــ مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی مملوکہ عورتوں

ہے، پس ان پر ان کو کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص اس کے علاوہ کچھ اور چاہے تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کو نباہتے ہیں۔ اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ ہوں گے۔ (المعارج ۱۵۔۳۵)

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جو آخرت کی ابدی جنتوں میں بسائے جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں صلاۃ (نماز) کے پابند رہے۔ یعنی انہوں نے اپنے رات دن کے اوقات کو خدا کی عبادت کے ماتحت کیا۔ جنہوں نے اپنی پوری زندگی اس طرح گزاری کہ وہ خدا کے آگے جھکے ہوئے تھے۔ اسی طرح ان کا حال یہ تھا کہ انہوں نے جو کچھ کمایا اس کو اپنی ذاتی چیز نہیں سمجھا بلکہ خدا کا عطیہ سمجھا۔ ان کا یہ احساس اس طرح ظاہر ہوا کہ وہ اپنے مال میں خدا کے دوسرے بندوں کو شریک کرتے رہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی پوری زندگی اس طرح گذری کہ وہ ہر لمحہ اس اندیشہ میں مبتلا رہے کہ وہ مرنے والے ہیں اور مرنے کے بعد انہیں خدا کی عدالت میں اپنے قول و عمل کا حساب دینا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنے شہوانی جذبات کو پوری طرح قابو میں رکھا۔ اس سلسلہ میں وہ خدا کے حدود سے باہر نہیں گئے۔ اسی طرح ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ امانت اور عہد کے معاملہ میں پوری طرح ذمہ دار ثابت ہوئے۔ انہوں نے نہ کسی سے خیانت کا معاملہ کیا اور نہ کسی سے بد عہدی کی۔ اسی طرح انہوں نے ہمیشہ اپنی گواہی کے تقاضے کو پورا کیا۔

جو لوگ دنیا میں اس طرح با اصول اور ذمہ دارانہ زندگی گذاریں وہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

71-213

اکابر پرستی

نوح نے کہا کہ اے میرے رب، انہوں نے میرا کہنا نہ مانا اور ایسے آدمیوں کی پیروی کی

جن کے مال اور اولاد نے ان کے گھاٹے ہی میں اضافہ کیا اور انہوں نے بڑی تدبیریں کیں۔ اور انہوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہر گز نہ چھوڑنا۔ اور تم ہر گز نہ چھوڑنا ود کو اور سواع کو اور یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو۔ اور انہوں نے بہت لوگوں کو بہکا دیا۔ اور اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ کر۔ اپنے گناہوں کے سبب سے وہ غرق کئے گئے۔ پھر وہ آگ میں داخل کر دیئے گئے۔ پس انہوں نے اپنے لئے اللہ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ پایا (نوح ۲۱۔۲۵)

حضرت نوح کی دعوت کا لوگوں نے کیوں انکار کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو حضرت نوح کے مقابلہ میں ان لوگوں کی باتیں زیادہ قابل لحاظ نظر آئیں جو تاریخی لحاظ سے بڑائی کا درجہ حاصل کئے ہوئے تھے۔ وقت کے بڑوں نے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں دعوت حق کا انکار کیا۔ اور جو چھوٹے تھے انہوں نے اس لئے انکار کیا کہ ان کے بڑے اس کے منکر بنے ہوئے تھے۔

حضرت نوح کے مخالفین نے حضرت نوح کے خلاف بڑی بڑی تدبیریں کیں۔ ان میں سے ایک خاص تدبیر یہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ نوح ہمارے اکابر (ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر) کے خلاف ہیں۔ یہ پانچوں قدیم زمانہ کے صالح افراد تھے۔ بعد کو وہ دھیرے دھیرے لوگوں کی نظر میں مقدس بن گئے۔ حتی کہ لوگوں نے انہیں پوجنا شروع کر دیا۔ ان کے نام پر لوگوں کو حضرت نوح کے خلاف بھڑکانا آسان تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ کہہ کر آپ کو لوگوں کی نظر میں مشتبہ کر دیا کہ آپ بزرگوں کے راستہ کو چھوڑ کر نئے راستہ پر چل رہے ہیں۔

یہی تاریخ کے ہر دور میں دعوت سے انحراف کا سبب رہا ہے۔ قدیم شخصیتیں تاریخی اسباب سے لوگوں کو بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں معاصر داعی لوگوں کو کم تر نظر آتا ہے۔ اس ظاہری فرق کی بنا پر لوگ قدیم شخصیتوں سے عقیدت رکھتے ہوئے معاصر داعی کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ ایک سنگین امتحان ہے جو قدیم لوگوں کو پیش آیا اور بعد کے زمانہ میں بھی وہ پیش آتا رہے گا۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر ایک کو اپنے اعتراف حق کا ثبوت دینا ہے۔

72-214

معرفت حق

یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے تو وہ جان لیں گے کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور کون تعداد میں کم ہے۔ کہو کہ میں نہیں جانتا کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے وہ قریب ہے یا میرے رب نے اس کے لئے لمبی مدت مقرر کر رکھی ہے۔ غیب کا جاننے والا وہی ہے۔ وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ سوا اس رسول کے جس کو اس نے پسند کیا ہو، تو وہ اس کے آگے اور پیچھے محافظ لگا دیتا ہے۔ تاکہ اللہ جان لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں اور وہ ان کے ماحول کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس نے ہر چیز کو گن رکھا ہے (الجن ۲۴-۲۸)

حق کا داعی بظاہر ایک عام انسان ہوتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں جن کے اوپر اس کی دعوت کی زد پڑ رہی ہو۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ داعیٔ حق کے خلاف کارروائی خود خدا کے خلاف کارروائی ہے، اور کون ہے جو خدا کے خلاف کارروائی کر کے کامیاب ہو۔

اس دنیا میں انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کو داعیٔ حق کے روپ میں پہچانے۔ وہ ایک انسان کو نمائندہ خدا کی حیثیت سے دریافت کرے۔ وہ کسی مادی زور یا تاریخی عظمتوں کے بغیر حق کے علم بردار کا اعتراف کرے۔ انسان کا یہی امتحان پیغمبروں کے دور میں بھی تھا اور اس کا یہی امتحان پیغمبروں کے دور کے بعد بھی باقی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ امتحان پیغمبر کی سطح پر ہوتا تھا اور بعد کو یہ امتحان داعی حق کی سطح پر ہوگا۔ معرفت حق کے اس امتحان میں پورا اترے بغیر کسی بھی شخص کی حق پرستی متحقق نہیں۔

73-215

قرض حسن

بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم دو تہائی رات کے قریب یا آدھی رات یا ایک تہائی

رات قیام کرتے ہو، اور ایک گروہ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا اندازہ ٹھہراتا ہے، اس نے جانا کہ تم اس کو پورا نہ کر سکو گے۔ پس اس نے تم پر مہربانی فرمائی، اب قرآن سے پڑھو جتنا تم کو آسان ہو، اس نے جانا کہ تم میں بیمار ہوں گے اور کتنے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے اور دوسرے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ پس اس میں سے پڑھو جتنا تم کو آسان ہو، اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض۔ اور جو بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے یہاں موجود پاؤ گے، وہ بہتر ہے اور ثواب میں زیادہ، اور اللہ سے معافی مانگو، بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے (المزمل ۲۰)

دین میں جو فرض اعمال ہیں وہ عام انسان کی استطاعت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقرر کئے گئے ہیں۔ مگر یہ فرائض لازمی حدود کو بتاتے ہیں۔ اس لازمی حد کے آگے بھی مطلوب اعمال ہیں۔ مگر وہ نوافل ہیں۔ مثلاً پنج وقتہ نمازوں کے بعد تہجد، زکوٰۃ کے بعد مزید انفاق، حج کے بعد عمرہ وغیرہ۔ یہ آدمی کے اپنے حوصلے کا امتحان ہے کہ وہ کتنا زیادہ عمل کرتا ہے اور آخرت میں کتنا زیادہ انعام کا مستحق بنتا ہے۔

"قرض حسن" کا لفظ بتاتا ہے کہ اس معاملہ کا تعلق صرف عبادات سے نہیں ہے بلکہ دوسرے اعمال دین سے بھی ہے۔ مثلاً اخلاقی سلوک میں لوگوں کے ساتھ اس سے زیادہ کرنا جتنا انہوں نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ اسی طرح دعوتی عمل میں کسی معاوضہ کی توقع کے بغیر زیادہ اپنا وقت اور مال خرچ کرنا، وغیرہ۔ سچا مومن وہ ہے جس کے تمام اعمال میں قرض حسن یا عمل مزید کا یہ روپ سرایت کئے ہوئے ہو۔

74-216

صفات مومن

اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑے کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ کرو کہ احسان کرو اور بہت بدلہ چاہو اور اپنے رب کے لئے صبر کرو (المدثر ۱۔۷)

اس دنیا میں اصل پیغمبرانہ کام انذار ہے۔ یعنی آخرت میں پیش آنے والے سنگین مسئلہ

سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل اللہ کی بڑائی سے لبریز ہو۔ جو اچھے اخلاق کا مالک ہو۔ جو ہر قسم کی برائی سے دور ہو۔ جو بدلہ کی امید کے بغیر نیکی کرے۔ جو دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں پر یک طرفہ صبر کر سکے۔

"وربک فکبر" سے مراد داخلی تکبیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دل و دماغ میں خدا کی عظمت کا تصور اتنا زیادہ چھا جائے کہ اس کا اظہار الفاظ کی صورت میں ہونے لگے۔ گویا اس آیت سے مراد وہی چیز ہے جس کو ذکر رب کہا جاتا ہے۔ جب ایک شخص کو خدا کی گہری معرفت ہوتی ہے تو اس کا سینہ خدا کی عظمت و کبریائی سے بھر جاتا ہے۔ اس کی روح خدا کی بڑائی کے احساس میں غرق ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان ہمیشہ خدا کے جلال و کمال کے تذکرے سے تر رہتی ہے۔ وہ اپنے اندر سے لے کر باہر تک خدا کی بڑائی کے احساس میں سرشار ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی انسان حقیقی مومن ہے اور ایسا ہی انسان دعوتِ حق کی ذمہ داریوں کو ادا کر سکتا ہے۔

75-217

نفس لوامہ

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔ کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کریں گے۔ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کی پور پور تک درست کر دیں۔ بلکہ انسان چاہتا ہے کہ ڈھٹائی کرے اس کے سامنے۔ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئے گا۔ پس جب آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھا کر دیے جائیں گے۔ اس دن انسان کہے گا کہ کہاں بھاگوں۔ ہرگز نہیں، کہیں پناہ نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کے پاس ٹھکانا ہے۔ اس دن انسان کو بتایا جائے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ بلکہ انسان خود اپنے آپ کو جانتا ہے، چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔ (القیامۃ ۱۔۱۵)

انسان کے اندر پیدائشی طور پر یہ شعور موجود ہے کہ وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرے۔ وہ

عین اپنی فطرت کے تحت یہ چاہتا ہے کہ برائی کرنے والے کو سزا ملے اور بھلائی کرنے والے کو انعام دیا جائے۔ یہی وہ شعور ہے جس کو قرآن میں نفس لوامہ کہا گیا ہے۔ یہ نفس لوامہ عالم آخرت کے حقیقی ہونے کی ایک نفسیاتی شہادت ہے۔ اس داخلی شہادت کے بعد جو شخص اس کے تقاضے پورے نہ کرے وہ گویا اپنی ہی مانی ہوئی بات کا انکار کر رہا ہے۔

اس آیت میں نفس لوامہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو عام طور پر ضمیر (Conscience) کہا جاتا ہے۔ یہ ضمیر استثنائی طور پر صرف انسان کے اندر موجود ہے۔ حیوانات بھی بظاہر انسان جیسی ایک مخلوق ہیں۔ مگر کسی بھی حیوان کے اندر ضمیر جیسی صفت موجود نہیں۔ انسان کے اندر استثنائی طور پر ضمیر جیسی ایک صفت کا موجود ہونا ثابت کرتا ہے کہ انسان کا معاملہ دوسرے حیوانات سے بالکل مختلف ہے۔ خود اپنے ہی فطری معیار کے مطابق، انسان یہ چاہتا ہے کہ اچھے اور برے کے درمیان فرق کیا جائے۔ اس لئے انسان کے ساتھ اگر احتساب کا معاملہ کیا جائے تو یہ عین وہی معاملہ ہوگا جو اس کی خود اپنی فطرت کا تقاضہ ہے۔

76-218

مقصد حیات

کبھی انسان پر زمانہ میں ایک وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو ایک مخلوط بوند سے پیدا کیا، ہم اس کو پلٹتے رہے۔ پھر ہم نے اس کو سننے والا، دیکھنے والا بنادیا۔ ہم نے اس کو راہ بجھائی، چاہے وہ شکر کرنے والا بنے یا انکار کرنے والا۔ (الدھر ۱۔۳)

قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا۔ اس وقت ساری دنیا میں کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رحم مادر میں انسان کا آغاز ایک مخلوط نطفہ سے ہوتا ہے۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ انسان نے یہ جانا کہ انسان (اور حیوان) کا ابتدائی نطفہ دو اجزاء سے مل کر بنتا ہے۔ ایک عورت کا بیضہ (Ovum) اور دوسرے مرد کا نطفہ (Sperm) یہ دونوں خوردبینی اجزاء جب باہم مل جاتے ہیں، اس وقت رحم مادر میں وہ چیز بننا شروع ہوتی جو بالآخر انسان کی صورت اختیار کرتی

ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال پہلے قرآن میں نطفہ امشاج (مخلوط نطفہ) کا لفظ آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے۔

قرآن میں اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔ مثالیں اپنی استثنائی نوعیت کی بنا پر واضح طور پر قرآن کو خدا کی کتاب ثابت کرتی ہیں۔ اور جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے تو اس کے بعد قرآن کا ہر بیان مجرد قرآن کا بیان ہونے کی بنیاد پر درست ماننا پڑے گا۔

77-219

مادی نعمتیں

بے شک ڈرنے والے سایہ میں اور چشموں میں ہوں گے، اور پھلوں میں جو وہ چاہیں۔ مزے کے ساتھ کھاؤ اور پیو، اس عمل کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے۔ ہم نیک لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ خرابی (ویل) ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔ کھاؤ اور برت لو تھوڑے دن، بے شک تم گناہ گار ہو۔ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھکو تو وہ نہیں جھکتے۔ خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔ اب اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے۔ (المرسلت ۴۱۔۵۰)

موجودہ دنیا میں خدا کی نعمتیں وقتی طور پر امتحان کی غرض سے رکھی گئی ہیں۔ آخرت میں خدا کی نعمتیں ابدی طور پر زیادہ کامل صورت میں ظاہر ہوں گی۔ آج ان نعمتوں میں ہر ایک حصہ پا رہا ہے۔ مگر آخرت کی اعلیٰ نعمتیں صرف ان لوگوں کا حصہ ہوں گی جنہوں نے آزادی کے حالات میں اطاعت کی۔ جو اس وقت جھکے جب کہ وہ جھکنے کے لئے مجبور نہ تھے۔ جو لوگ قول پر جھکیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ ویل کو دیکھ کر جھکیں ان کے لئے جہنم۔

78-220

جنت کی دنیا

بے شک ڈرنے والوں کے لئے کامیابی ہے۔ باغ اور انگور اور نوخیز ہم سن لڑکیاں اور بھرے

ہوئے جام۔ وہاں وہ لغو بات نہ سنیں گے۔ بدلہ تیرے رب کی طرف سے، ہوگا۔ ان کے عمل کے حساب سے رحمان کی طرف سے جو آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کا رب ہے، کوئی قدرت نہیں رکھتا کہ اس سے بات کرے۔ جس دن روح اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا مگر جس کو رحمان اجازت دے، اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔ یہ دن برحق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف ٹھکانا بنالے۔ ہم نے تم کو قریب آجانے والے عذاب سے ڈرادیا ہے، جس دن آدمی اس کو دیکھ لے گا جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے۔ اور منکر کہے گا، کاش میں مٹی ہوتا۔ (النبا ۳۱۔۴۰)

جنت کا ماحول لغو اور جھوٹی باتوں سے پاک ہوگا۔ اس لئے جنت کی لطیف و نفیس دنیا میں بسانے کے لئے صرف وہی لوگ چنے جائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس اہلیت کا ثبوت دیا ہو کہ وہ لغو اور جھوٹ سے دور رہ کر زندگی گزارنے کا ذوق رکھتے ہیں۔

جنت میں کسی شخص کا داخلہ کسی کی شفارش کی بنیاد پر نہیں ہوگا۔ اور نہ وہ کسی دوسری خوش فہمی کی بنیاد پر ہوگا۔ جنت ایک انتہائی نفیس اور لطیف کالونی ہے۔ وہاں کی دنیا میں داخلہ صرف ان انسانوں کے لئے مقدر ہے جو اس کے مطابق لطیف اور نفیس روح لے کر وہاں پہنچیں۔ موجودہ دنیا اسی قسم کے اعلیٰ انسانوں کے انتخاب کے لئے بنائی گئی ہے۔ جو لوگ موجودہ امتحان کی دنیا میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کریں گے وہی جنت میں داخلہ کے مستحق قرار پائیں گے۔

79-221

دنیا کی آزمائش

پھر جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا۔ جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا۔ اور دیکھنے والوں کے سامنے دوزخ ظاہر کردی جائے گی۔ پس جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہوگا اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا۔ (النازعات ۴۳۔۴۱)

آدمی دو چیزوں کے درمیان ہے۔ ایک موجودہ دنیا جو سامنے ہے۔ اور دوسرے آخرت کی دنیا

جو غیب میں ہے۔ آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے۔ مگر یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے نفس کی خواہش پر کنٹرول کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

موجودہ دنیا مختلف قسم کی آزمائشوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہ آزمائشیں بار بار انسان کو نفسیاتی خواہشوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ جو آدمی دنیا کی رغبتوں میں کھو جائے، وہ اپنے امتحان میں ناکام رہا۔ اس برے انجام سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو آخرت کے دن خدا کی عدالت میں حاضری پر یقین رکھتا ہو۔ یہ یقین اس کو نفسیاتی خواہشوں میں مبتلا ہونے سے بچالے گا۔

80-222

قیامت کا زلزلہ

پس جب وہ کانوں کو بہرہ کر دینے والا شور برپا ہوگا۔ جس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے، اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بیٹوں سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اس دن ایسا فکر لگا ہو گا جو اس کو کسی اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، خوشی کرتے ہوئے۔ اور کچھ چہروں پر اس دن خاک اڑ رہی ہوگی، ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی لوگ منکر ہیں، ڈھیٹ ہیں۔ (عبس ۳۳۔۴۲)

موجودہ دنیا کے ماحول میں آدمی کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنے اہل و عیال سے ہوتی ہے۔ وہ اپنے مادی مفادات کے لئے سب سے زیادہ محبت اپنے دل میں پاتا ہے۔ مگر یہ دلچسپی اور محبت محض غفلت کی وجہ سے ہے نہ کہ شعور کی وجہ سے۔ چونکہ انسان ظاہری حالات کی بنا پر اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ وہ ایک عظیم خطرہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ وہ عنقریب آخرت کے زلزلہ خیز حالات سے دوچار ہونے والا ہے۔ مستقبل میں پیش آنے والی اس صورت حال سے بے خبری اس کو مادی چیزوں میں مشغول کئے ہوئے ہے۔ اگر اس کو آنے والے زلزلہ کا احساس ہو جائے تو اس کی موجودہ دلچسپیاں اچانک ختم ہو جائیں۔ آج ہی اس کا وہ حال ہو جائے جو کل اس کا حال ہونے والا ہے، اگرچہ کل ہوش میں آنا کسی کو فائدہ دینے والا نہیں۔

81-223

کائنات کی نشانی

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی۔ اور رات کی جب وہ جانے لگے۔ اور صبح کی جب وہ آنے لگے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ قوت والا، عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے۔ اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور وہ غیب کی باتوں کا حریص نہیں۔ اور وہ شیطان مردود کا قول نہیں۔ تم کدھر جا رہے ہو۔ یہ تو بس عالم والوں کے لئے ایک نصیحت ہے، اس کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔ اور تم نہیں چاہ سکتے مگر یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے۔ (التکویر ۱۵۔۲۹)

زمین پر رات دن کا آنا اور انسان کے مشاہدہ میں ستاروں کے مقامات کا بدلنا زمین کی محوری گردش کی بنا پر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان الفاظ کا مطلب یہ ہوگا کہ زمین کی محوری گردش کا نظام اس بات پر گواہ ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن خدا کا کلام ہے جو فرشتہ کے ذریعہ ان پر اترا ہے۔

زمین کی محوری گردش اس کائنات کا ایک انتہائی نادر اور انتہائی عظیم واقعہ ہے۔ یہ واقعہ گویا ایک ماڈل ہے جو وحی کے معاملہ کو ہمارے لئے قابل فہم بناتا ہے۔ اگر یہ تصور کیجئے کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہوئی وسیع خلا میں سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو ایسا محسوس ہوگا گویا ریموٹ کنٹرول کا کوئی طاقت ور نظام ہے جو اس کو انتہائی صحت کے ساتھ کنٹرول کر رہا ہے۔ فرشتہ کے ذریعہ ایک انسان اور خدا کے درمیان ربط قائم ہونا بھی اسی طرح کا کائناتی اتصال کا ایک واقعہ ہے۔ پہلا واقعہ تمثیل کے روپ میں دوسرے واقعہ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

82-224

انسان کا آغاز و انجام

اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال رکھا ہے جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تیرے اعضاء کو درست کیا، پھر تجھ کو متناسب بنایا۔ جس صورت میں

جاہا تم کو ترتیب دے دیا۔ ہر گز نہیں۔ بلکہ تم انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہو۔ حالاں کہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ عیش میں ہوں گے۔ اور بے شک گنہ گار دوزخ میں۔ انصاف کے دن وہ اس میں ڈالے جائیں گے۔ وہ اس سے جدا ہونے والے نہیں۔ اور تم کو کیا خبر کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ اس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے لئے کچھ نہ کر سکے گی۔ اور معاملہ اس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہو گا۔ (الانفطار ٦۔١٩)

انسان کی تخلیق انتہائی استثنائی طور پر ایک بے حد موزوں تخلیق ہے۔ جسمانی بناوٹ اور ذہنی صلاحیت دونوں کے اعتبار سے انسان ایک انوکھا وجود ہے۔ اس قسم کی نادر تخلیق بیک وقت دو باتوں کا ثبوت دے رہی ہے۔ ایک طرف یہ کہ انسان کا خالق ایک بے حد عظیم ہستی ہے۔ خالق اگر بے حد عظیم نہ ہو تو وہ انسان جیسی مخلوق کو وجود میں نہ لا سکے۔

اسی کے ساتھ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ انسان جیسی ایک مخلوق کی پیدائش بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ یقینی طور پر اس تخلیق کا ایک با معنی مقصد ہے۔ اور وہ با معنی مقصد یہی ہے کہ جو لوگ خالق کے منشاء کے مطابق زندگی گذاریں وہ خالق کی طرف سے اعلیٰ انعام پائیں۔ اور جو لوگ خالق سے سرکشی کریں، وہ اپنے عمل کے مطابق اس کی سزا سے دوچار ہوں۔

83-225

انصاف کا طریقہ

خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والے کی۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں۔ ایک بڑے دن کے لئے جس دن تمام لوگ خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے (التطفیف ١۔٦)

دنیا میں آدمی ہر لمحہ اس طرح زندگی گذارتا ہے کہ کبھی وہ کسی سے لیتا ہے اور کبھی وہ کسی کو دیتا ہے۔ یہ لینا اور دینا صرف مالی معاملات میں نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر معاملہ میں ہوتا ہے۔ کسی سے کچھ کہنا اور اس سے کچھ سننا، یہ بھی لینا اور دینا ہے۔ کسی کو کچھ دینا اور کسی سے کچھ پانا، یہ بھی لین

دین ہے۔ کسی سے اپنے لئے امید رکھنا اور کسی کے ساتھ اس کی امید میں پورا اترنا یا نہ اترنا، یہ بھی ایک لین دین ہے۔ غرض ہر لمحہ اور ہر معاملہ میں آدمی کسی کو کچھ دینے والا ہوتا ہے اور کسی سے کچھ پانے والا۔ یہ اجتماعی زندگی کا لازمی پہلو ہے۔ کوئی اجتماعی زندگی اس لین دین سے خالی نہیں ہو سکتی۔

اس طرح کے معاملات میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ لینے اور دینے میں فرق نہ کرے۔ وہ ایسا نہ کرے کہ خود تو دینے کے وقت دوسروں کو برا دے اور دوسروں سے ہمیشہ اچھا لینا چاہے۔ اس قسم کی نابرابری یا بے انصافی خدا کی شریعت میں حرام ہے۔ اجتماعی زندگی میں اس طرح ناپ اور تول میں فرق کرنے والے خدا کی سخت پکڑ میں آجائیں گے۔ خدا کی رحمت صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو خود بھی دوسروں کے لئے اسی طرح با انصاف ثابت ہوں جس طرح وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کے ساتھ انصاف کریں۔

84-226

انسان کا معاملہ

اے انسان، تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف جا رہا ہے۔ پھر اس سے ملنے والا ہے۔ تو جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ اور وہ اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش آئے گا۔ اور جس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا، اور جہنم میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے لوگوں میں بے غم رہتا تھا۔ اس نے خیال کیا تھا کہ اس کو لوٹنا نہیں ہے۔ کیوں نہیں، اس کا رب اس کو دیکھ رہا تھا۔ (الانشقاق ۶۔۱۴)

دنیا میں زندگی گذارنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی حقیقت کے بارے میں سنجیدہ ہو۔ جس آدمی کے اندر یہ سنجیدگی ہوگی، اس کی زندگی لازماً ذمہ دارانہ زندگی بن جائے گی۔ وہ اندیشہ کی نفسیات میں جئے گا۔ کیوں کہ اس کو یہ ڈر ہوگا کہ اگر وہ خدا کی رحمت سے محروم رہ گیا تو اس کے لئے ابدی عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے برعکس جو آدمی حقیقت کے بارہ میں سنجیدہ نہ ہو، وہ بے فکری کی زندگی گذارے گا۔ وہ کل کے انجام سے غافل ہو کر آج کی دلچسپیوں میں گم رہے گا۔

جو لوگ آج کی لذتوں اور راحتوں میں رہیں وہ کل کے معاملہ سے غافل ہو جائیں گے۔ اور پھر اس غفلت کا برا نتیجہ آخرت میں بھگتیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ کل کے اندیشہ میں مبتلا ہوں، ان کے لئے موجودہ دنیا فرض کی ادائیگی کی جگہ بن جائے گی نہ کہ عیش و عشرت حاصل کرنے کی جگہ۔ اور ان دو قسم کے انسانوں کا انجام یکساں نہیں ہو سکتا۔

85-227

بڑی کامیابی

جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی تو ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔ اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیا ان کے لئے باغ ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ وہی آغاز کرتا ہے اور وہی لوٹائے گا۔ اور وہ بخشنے والا ہے، محبت کرنے والا ہے، عرش بریں کا مالک، کر ڈالنے والا جو چاہے۔ (البروج ۱۰۔۱۶)

ایک آدمی کے سامنے حق آئے اور وہ اس کو قبول نہ کرے تو بلاشبہ یہ ایک جرم ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ جرم یہ ہے کہ آدمی حق کے داعی کا دشمن بن جائے۔ وہ اس کے خلاف سازشیں کرے۔ وہ اپنے قول و عمل کی صلاحیت کو اس کے خلاف استعمال کرنے کے لئے سرگرم ہو جائے۔ ایسے لوگ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمتوں سے دور ہو جائیں گے۔

اس کے برعکس جو لوگ حق کی پکار سن کر اس کا اعتراف کریں اپنی زندگیوں کو اس پر ڈھال دیں اور حق کے داعیوں کا ساتھ دے کر اس کے مشن کو مضبوط کریں، وہ اللہ کی بے پناہ رحمتوں کی صورت میں اس کا اجر پائیں گے۔ وہ آخرت کی ابدی جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

86-228

آدمی کی نگرانی

قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔ اور تم کیا جانو کہ وہ رات کو نمودار

ہونے والا کیا ہے، چمکتا ہوا تارہ۔ کوئی جان ایسی نہیں جس کے اوپر نگہبان نہ ہو (الطارق ا۔۴)

انسان کے اوپر ستارہ کا چمکنا تمثیل ربانی میں اس واقعہ کی یاددہانی ہے کہ کوئی دیکھنے والا اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دیکھنے والا انسان کے اعمال کو ریکارڈ کر رہا ہے۔ وہ موت کے بعد دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا۔ اور اس سے اس کے تمام اعمال کا حساب لے گا۔ یہ صرف امتحان کی مہلت ہے جو انسان کے درمیان اور اس وقت کے درمیان حد فاصل بنی ہوئی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کا وہ انجام سامنے آجائے گا جس سے آج وہ بظاہر بہت دور نظر آتا ہے۔

87-229

فلاح انسانیت

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔ اور اپنے رب کا نام لیا۔ پھر نماز پڑھی۔ بلکہ تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔ اور آخرت بہتر ہے اور پائدار ہے۔ یہی اگلے صحیفوں میں بھی ہے، موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں۔ (الاعلیٰ ۱۴۔۱۹)

خدا کا دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ خدا نے اپنا جو دین قرآن میں ظاہر فرمایا ہے، وہی پچھلے پیغمبروں کے دور میں بھی تھا۔ پیغمبر اسلام اور پچھلے پیغمبروں کے درمیان شرعت اور منہاج (المائدہ ۴۸) کے اعتبار سے جو فرق رہا ہے وہ اضافی ہے نہ کہ حقیقی۔ اس قسم کے اضافی فرق خود ایک ہی پیغمبر کے مختلف احوال میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پیغمبر اسلام کے مکی اور مدنی دور میں صلاۃ اور صوم کے احکام میں فرق ہونا، وغیرہ۔

خدا کا اصل دین تمام پیغمبروں پر نازل کیا گیا اس کے مطابق فلاح انسانی کا اصل انحصار اسی پر ہے کہ آدمی اپنا تزکیہ کر کے اپنے آپ کو خدا کا مطلوب بندہ بنائے۔ یہ خود تعمیری کی ایک مہم ہے جس میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جو موجودہ دنیا کے وقتی مفادات میں نہ الجھیں اور آئندہ آنے والی آخرت کی دنیا کو اپنی ترجیح بنائیں۔

جو لوگ ایسا کریں، ان کے اندر ایک عظیم روحانی انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ ان کا سینہ خدا

ی عظمت و جلال کے احساس سے بھر جاتا ہے۔ وہ اپنی انانیت کو ختم کر کے خدا کے آگے جھک جاتے ہیں، جس کا ایک خارجی مظہر نماز ہے۔

88-230

گرد و پیش کی نشانیاں

کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا۔ اور آسمان کو کہ وہ کس طرح بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کو کہ وہ کس طرح کھڑا کیا گیا۔ اور زمین کو کہ وہ کس طرح بچھائی گئی۔ پس تم یاددہانی کرنے والے ہو۔ تم ان پر داروغہ نہیں۔ مگر جس نے روگردانی کی اور انکار کیا۔ تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔ ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے۔ پھر ہمارے ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔ (الغاشیہ ۱۷۔۲۶)

آدمی دیکھتا ہے کہ اونٹ جیسا عجیب الخلقت جانور اس کا مطیع ہے۔ آسمان اپنی ساری عظمتوں کے باوجود انسان کے لئے مسخر ہے۔ زمین ہماری کسی کوشش کے بغیر ہمارے لئے حد درجہ موافق بنی ہوئی ہے۔ یہ واقعات سوچنے والے کو خدا اور آخرت کی یاددہانی کراتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کے اس نظام سے یاددہانی کی غذا لیں انہوں نے اپنے لئے خدا کی ابدی نعمتوں کا استحقاق ثابت کیا۔ اور جو لوگ غفلت میں پڑے رہیں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ صرف اس قابل ہیں کہ ان کو ہر قسم کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جائے۔

89-231

تکلیف اور راحت

انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے اور اس کو عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو عزت دی۔ اور جب وہ اس کو آزماتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور تم مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے۔ اور تم وراثت

کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور تم مال سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہو۔ ہر گز نہیں، جب زمین کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ اور تمہارا رب آئے گا اور فرشتے آئیں گے قطار در قطار۔ اور اس دن جہنم لائی جائے گی۔ اس دن انسان کو سمجھ آئے گی۔ اور اب سمجھنے کا موقع کہاں۔ وہ کہے گا، کاش میں اپنی زندگی میں کچھ آگے بھیجتا۔ پس اس دن نہ تو خدا کے برابر کوئی عذاب دے گا۔ اور نہ اس کے باندھنے کے برابر کوئی باندھے گا۔ اے نفس مطمئن، چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری جنت میں (الفجر ۱۵۔۳۰)

دنیا میں آدمی کو دو قسم کے احوال پیش آتے ہیں۔ کبھی پانا اور کبھی محروم ہو جانا۔ یہ دونوں حالتیں امتحان کے لئے ہیں۔ وہ اس جانچ کے لئے ہیں کہ آدمی کس حالت میں کون سا ردعمل پیش کرتا ہے۔ جس شخص کا معاملہ یہ ہو کہ جب اس کو کچھ ملے تو وہ فخر کرنے لگے اور جب اس سے چھینا جائے تو وہ منفی نفسیات میں مبتلا ہو جائے، ایسا شخص امتحان میں ناکام ہو گیا۔

دوسرا انسان وہ ہے کہ جب اس کو ملا تو اس نے خدا کے سامنے جھک کر اس کا شکر ادا کیا۔ اور جب اس سے چھینا گیا تو دوبارہ اس نے خدا کے آگے جھک کر اپنے عجز کا اقرار کیا۔ یہی دوسرا انسان ہے جس کو یہاں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے، یعنی مطمئن روح۔

نفس مطمئن کا مقام اس شخص کو ملتا ہے جو کائنات میں خدا کی نشانیوں پر غور کرے۔ جو تاریخ کے واقعات سے عبرت و نصیحت کی غذا لے سکے۔ جو اس بات کا ثبوت دے کہ جب اس کی ذات میں اور حق میں ٹکراؤ ہو گا تو وہ اپنی ذات کو نظر انداز کر دے گا اور حق کو قبول کر لے گا۔ جو ایک بار حق کو مان لینے کے بعد پھر اس کو کبھی نہ چھوڑے، خواہ اس کی خاطر اسے اپنے آپ کو کچلنا پڑے، اور خواہ اس کے نتیجہ میں اس کی زندگی ویران ہو جائے۔

90-232

بلند کرداری

نہیں، میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی۔ اور تم اس میں مقیم ہو۔ اور قسم ہے باپ کی اور اس

کی اولاد کی۔ ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا زور نہیں۔ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں۔ اور ایک زبان اور دو ہونٹ۔ اور ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دئے۔ پھر وہ گھاٹی پر نہیں چڑھا۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ گھاٹی۔ گردن کو چھڑانا۔ یا بھوک کے زمانہ میں کھلانا۔ قرابت دار یتیم کو، یا خاک نشین محتاج کو۔ پھر وہ ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو صبر کی اور ہمدردی کی نصیحت کی۔ یہی لوگ نصیب والے ہیں۔ اور جو ہماری آیتوں کے منکر ہوئے وہ بدبختی والے ہیں۔ ان پر آگ چھائی ہو گی۔ (البلد ۱۔۲۰)

انسان کسی حال میں اپنے آپ کو مشقتوں سے آزاد نہیں کر پاتا۔ اس سے معلو ہوا کہ انسان کسی بالاتر قوت کے ماتحت ہے۔ اسی طرح انسان کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ کوئی برتر آنکھ بھی ہے جو اس کو دیکھ رہی ہے۔ انسان کی قوت نطق اشارہ کرتی ہے کہ اس کے اوپر بھی ایک صاحب نطق ہے جس نے اس کے اوپر اپنے نطق کا اظہار کیا۔ اور اس کو ہدایت کا راستہ دکھایا۔ آدمی اگر حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو پہچان لے تو یقیناً وہ خدا کو بھی پہچان لے گا۔

خدا نے انسان کو دو قسم کی بلند کرداری کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک انسان کے ساتھ منصفانہ سلوک اور انسان کی ضرورتوں میں اس کے کام آنا۔ دوسری چیز اللہ پر ایمان و یقین ہے۔ یہ ایمان و یقین جب آدمی کے اندر گہرائی کے ساتھ اترتا ہے تو وہ آدمی کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ متعدی بن جاتا ہے۔ ایسا انسان دوسروں کو بھی اسی حق پر لانے کی کوشش کرنے لگتا ہے جس کو وہ خود اختیار کیے ہوئے ہے۔

91-233

سہ گانہ رہنمائی

قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ چڑھنے کی۔ اور چاند کی جب کہ وہ سورج کے پیچھے آئے۔ اور دن کی جب کہ وہ اس کو روشن کر دے۔ اور رات کی جب کہ وہ اس کو چھپا لے۔ اور

آسمان کی اور جیسا کہ اس کو بنایا۔ اور زمین کی اور جب کہ اس کو پھیلایا۔ اور جان کی جیسا کہ اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو سمجھ دی اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔ کامیاب ہوا جس نے اس کو پاک کیا۔ اور نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔ (الشمس ۱۔۱۰)

انسان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے سہ گانہ انتظام کیا ہے۔ ایک طرف کائنات اس طرح بنائی گئی ہے کہ خدا کی مرضی کا عملی اظہار بن گئی ہے۔ دوسری طرف انسان کے اندر نیکی اور بدی کا وجدانی شعور رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید اہتمام یہ فرمایا کہ پیغمبروں کے ذریعہ انسان کی قابل فہم زبان میں اس کو یہ بتا دیا گیا کہ حق و باطل کیا ہے اور ظلم اور انصاف کیا ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ راہ راست پر نہ آئیں وہ بلاشبہ ظالم ہیں۔

92-234

اللہ کی رہنمائی

قسم ہے رات کی جب کہ وہ چھا جائے۔ اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو اور اس کی جو اس نے پیدا کئے نر اور مادہ۔ کہ تمہاری کوششیں الگ ہیں۔ پس جس نے دیا اور وہ ڈرا اور اس نے بھلائی کو سچ جانا۔ تو اس کو ہم آسان راستے کے لئے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور بے پروا رہا، اور بھلائی کو جھٹلایا، تو ہم اس کو سخت راستہ کے لئے سہولت دیں گے۔ اور اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا جب وہ گڑھے میں گرے گا۔ بے شک ہمارے ذمہ ہے راہ بتانا۔ اور بے شک ہمارے اختیار میں ہے آخرت اور دنیا۔ پس میں نے تم کو ڈرا دیا بھڑکتی ہوئی آگ سے۔ اس میں وہی پڑے گا جو بڑا بدبخت ہے۔ جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔ اور ہم اس سے بچا دیں گے زیادہ ڈرنے والے کو۔ جو اپنا مال دیتا ہے پاکی حاصل کرنے کے لئے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ مگر صرف اپنے خدائے برتر کی خوشنودی کے لئے۔ اور عنقریب وہ خوش ہو جائے گا۔ (اللیل ۱۔۲۱)

دنیا میں تمام چیزیں جوڑے جوڑے ہیں۔ نر اور مادہ، رات اور دن، مثبت ذرہ اور منفی ذرہ، میٹر اور اینٹی میٹر۔ اس دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ یہ

واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات میں مقصدیت ہے۔ ایسی بامقصد کائنات میں یہ ناممکن ہے کہ یہاں اچھا عمل اور برا عمل دونوں بالکل یکساں انجام پر ختم ہو۔ کائنات اپنے خالق کا جو تعارف کرا رہی ہے اس سے یہ بات مطابقت نہیں رکھتی۔

اللہ کا تعلق اپنے بندوں سے صرف حاکم کا نہیں، بلکہ مددگار کا بھی ہے۔ وہ اپنے ان بندوں کا راستہ ہموار کرتا ہے جو اس کی طرف چلنا چاہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ سرکشی کا راستہ اختیار کریں وہ انھیں سرکشی کے راستہ پر دوڑنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

93-235

خدا کی مدد

قسم ہے روز روشن کی۔ اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ تمہارے رب نے تم کو نہیں چھوڑا، اور نہ وہ تم سے بیزار ہوا۔ اور یقیناً آخرت تمہارے لئے دنیا سے بہتر ہے۔ اور عنقریب اللہ تجھ کو دے گا۔ پھر تو راضی ہو جائے گا۔ کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانا دیا۔ اور تم کو متلاشی پایا تو راہ دکھائی۔ اور تم کو نادار پایا تو تم کو غنی کر دیا۔ پس تم یتیم پر سختی نہ کرو۔ اور تم سائل کو نہ جھڑکو۔ اور تم اپنے رب کی نعمت بیان کرو۔ (الضحیٰ ۱۔۱۱)

اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں دن بھی آتا ہے اور رات بھی۔ دونوں کے ملنے سے یہاں کا نظام مکمل ہوتا ہے۔ اس طرح انسان کے ارتقاء کے لئے بھی سختی اور نرمی دونوں کا پیش آنا ضروری ہے۔ اس دنیا میں ایک بندۂ خدا کے ساتھ سختی کے حالات اس لئے پیش آتے ہیں کہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں اس لئے ڈالی جاتی ہیں تاکہ اس کا مستقبل اس کے حال سے زیادہ بہتر ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ یتیم پیدا ہوئے۔ پھر اللہ نے آپ کو بہترین سرپرست عطا فرمایا۔ آپ تلاش حق میں سرگرداں تھے۔ پھر اللہ نے آپ کے لئے حق کا دروازہ کھول دیا۔ آپ بظاہر بے مال تھے، پھر اللہ نے آپ کو آپ کی اہلیہ (خدیجہ) کے ذریعہ صاحب مال بنا دیا۔ یہ صرف ایک انفرادی

مثال نہیں بلکہ اس کا ایک عمومی پہلو بھی ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ اللہ کس طرح اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اس انسان کی مدد کرتا ہے جو اس سے مدد کا طالب ہو۔

94-236

عُسر میں یُسر

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جس نے تمہاری پیٹھ جھکا دی تھی۔ اور ہم نے تمہارے ذکر کو بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو (الانشراح ۱۔۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقت جاننے کے لئے مضطرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حقیقت کا علم دے کر آپ کی تلاش کو معرفت میں تبدیل کر دیا۔ حقائق کی معرفت کے لئے آپ کا سینہ کھول دیا پھر آپ نے مکہ میں توحید کی دعوت شروع کی تو بظاہر سخت مخالفتوں کا سامنا پیش آیا۔ مگر انہیں مخالفتوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ آپ کا چرچا سارے ملک میں پھیل گیا۔

یہی موجودہ دنیا کے لئے اللہ کا قانون ہے۔ یہاں ابتداءً انسان کے ساتھ عُسر کے حالات پیش آتے ہیں۔ لیکن اگر وہ صبر کے ساتھ اس پر جما رہے تو یہ عُسر اس کے لئے نئے یسر تک پہنچنے کا زینہ بن جاتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف دیکھے، وہ اپنی استطاعت کے بقدر اپنی جدوجہد کو برابر جاری رکھے۔ وہ کسی حال میں بھی مایوسی کا شکار نہ ہو۔

95-237

پیغمبروں کی تاریخ

قسم ہے تین کی اور زیتون کی۔ اور طور سینا کی۔ اور اس امن والے شہر کی۔ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔ تو اب کیا ہے جس سے تم بدلہ ملنے کو جھٹلاتے ہو۔ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں۔ (التین ۱۔۸)

تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں جن کے قریب بیت المقدس واقع ہے۔ یعنی حضرت مسیح کا مقام عمل۔ طور سینین سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ پر خدا نے براہ راست وحی فرمائی۔ بلد امین سے مراد مکہ ہے جہاں پیغمبر اسلام مبعوث ہوئے۔ یہ تینوں مقامات پیغمبروں کی تاریخ کو یاد دلاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ صلاحیتیں اس لئے ہیں کہ انسان پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر کئے جانے والے حق کو پہچانے اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بنائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ عزت اور بلندی کا ابدی مقام پائیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدا کی مرضی کے تابع نہ کریں، ان سے موجودہ نعمتیں بھی چھین لی جائیں گی اور کامل محرومی کے سوا کوئی جگہ نہ ہوگی جہاں ان کو ٹھکانا مل سکے ــــــــ پیغمبروں کی بعثت اور پیغمبروں کے ذریعہ ظاہر ہونے والے نتائج اس کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔

95-238

قرأت و قلم

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ پیدا کیا انسان کو علق سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا (العلق ۱۔۵)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے معمولی مادی اجزاء سے پیدا کیا۔ پھر اس کو یہ نادر صلاحیت دی کہ وہ پڑھے اور الفاظ کے ذریعہ معانی کا ادراک کر سکے۔ پھر انسان کو یہ مزید صلاحیت دی گئی کہ وہ قلم کو استعمال کرے اور اس طرح اپنے علم کو مدون اور محفوظ کر سکے۔ قرأت کی صلاحیت اگر آدمی کو خود پڑھنے کے قابل بناتی ہے تو قلم اس کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے علم کو وسیع پیمانہ پر دوسروں تک پہنچا سکے۔

قرأت اور قلم کی یہ صلاحیت انسان کو خصوصی طور پر اس لئے دی گئی ہے تاکہ اس کے درمیان علم و تحقیق کی سرگرمیاں جاری ہوں۔ وہ حقیقت کو دریافت کرے۔ اور پھر اس کو تمام انسانیت تک پہنچائے۔

97-239

شب قدر

ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں۔ اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں ہر حکم لے کر۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے، صبح نکلنے تک (القدر ۱۔۵)

سال کی ایک خاص رات (غالباً ماہ رمضان کے اخیر عشرہ کی کوئی رات) اللہ تعالیٰ کے یہاں سالانہ فیصلہ کی رات ہے۔ دنیا کے انتظام کے متعلق جو کام اس سال کے لئے مقدر ہیں ان کے نفاذ کی تعیین کے لئے اس رات کو فرشتے اترتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک خاص رات میں قرآن کا نزول شروع ہوا۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس رات کو زمین پر فرشتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ اس سے زمین پر خاص طرح کا روحانی ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ اپنے اندر روحانیت بیدار کئے ہوئے ہوں وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کے اندر غیر معمولی روحانی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے دینی عمل کی قدر و قیمت عام حالات سے بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔

شب قدر سے فیض پانے کا معاملہ دن اور تاریخ کی نسبت سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا انحصار ذاتی استعداد پر ہے۔ استعداد کے بغیر کوئی شخص شب قدر کی رحمتوں کو نہیں پا سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے سورج کے نکلنے کے بعد اس کی روشنی سے صرف آنکھ والے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ بے آنکھ والے لوگ روشن سورج کے طلوع ہونے کے بعد بھی اس کے فائدہ سے محروم رہیں گے۔

98-240

دین قیم

وہ متفرق نہیں ہوئے جن کو کتاب دی گئی تھی مگر واضح دلیل آجانے کے بعد۔ حالاں کہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں۔ اس کے لئے دین کو خالص کر دیں، یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں، اور یہی درست دین ہے۔ (البینہ ۴۔۵)

خدا کا دین قیم یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کی عبادت کرے۔ وہ دل سے اس کا چاہنے والا بن جائے۔ وہ نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ یہی خدا کی طرف سے آنے والا اصل دین ہے۔ سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اس دین قیم کو اختیار کریں اور سب سے برے لوگ وہ ہیں جو اس دین قیم کو اختیار نہ کریں یا اس کے سوا کوئی اور دین وضع کریں اور اس خود ساختہ دین کو دین قیم کا نام دے دیں۔

99-241

قیامت کا زلزلہ

جب زمین شدت سے ہلا دی جائے گی۔ اور زمین اپنا بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہوا۔ اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی۔ کیوں کہ تمہارے رب کا اس کو یہی حکم ہو گا۔ اس دن لوگ الگ الگ نکلیں گے تا کہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔ پس جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس شخص نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (الزلزال ۱۔۸)

قیامت کا زلزلہ مدت امتحان کے ختم ہونے کا اعلان ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب لوگوں سے وہ آزادی چھن گئی جو امتحان کی مصلحت کی بنا پر انہیں حاصل تھی۔ اب وہ وقت آ گیا جب لوگوں کو ان کے عمل کا بدلہ دیا جائے۔ آج خدا کی دنیا بظاہر خاموش ہے مگر جب حالات بدلیں گے تو یہاں کی ہر چیز بولنے لگے گی۔ موجودہ زمانہ کی ایجادات نے ثابت کیا ہے کہ بے جان چیزیں بھی "بولنے" کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسٹوڈیو میں کیے ہوئے عمل کو فلم اور ریکارڈ پوری طرح دہرا دیتے ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا گویا بہت بڑا خدائی اسٹوڈیو ہے اس کے اندر انسان جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ بولتا ہے وہ سب ہر لمحہ محفوظ ہو رہا ہے۔ اور جب وقت آئے گا تو ہر ایک کی کہانی کو یہ دنیا اس طرح دہرا دے گی کہ اس کی کوئی بھی بات اس سے بچی ہوئی نہ ہو گی، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

100-242

ناشکری نہیں

قسم ہے ان گھوڑوں کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ پھر ٹاپ مار کر چنگاری نکالنے والے۔

پھر صبح کے وقت چھاپا مارنے والے۔ پھر اس میں غبار اڑانے والے۔ پھر اس وقت فوج میں گھس جانے والے۔ بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ اور وہ مال کی محبت میں بہت شدید ہے۔ کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ قبروں سے نکالا جائے گا۔ اور نکالا جائے گا جو کچھ دلوں میں ہے۔ بے شک اس دن ان کا رب ان سے خوب باخبر ہوگا۔ (العٰدیٰت ۱۔۱۱)

گھوڑا ایک نہایت وفادار جانور ہے۔ وہ اپنے مالک کے لئے اپنے آپ کو آخری حد تک قربان کر دیتا ہے۔ حتی کہ جنگ کے میدان میں بھی وہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ یہ گویا ایک علامتی مثال ہے جو انسان کو بتاتی ہے کہ اسے کیسا بننا چاہئے۔ انسان کو بھی اپنے رب کا اسی طرح وفادار بننا چاہئے جیسا کہ گھوڑا انسان کا وفادار ہوتا ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔

اس دنیا میں جانور اپنے مالک کا شکر گزار ہے مگر انسان اپنے رب کا شکر گزار نہیں۔ یہاں جانور اپنے مالک کا حق پہچانتا ہے مگر انسان اپنے رب کا حق نہیں پہچانتا۔ یہاں جانور اپنے مالک کی اطاعت میں سرگرم ہے۔ مگر انسان اپنے رب کی اطاعت میں سرگرم نہیں۔

انسان اسی جانور کی قدر کرتا ہے جو اس کا وفادار ہو۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ اس راز کو نہ جانے کہ خدا کے یہاں وہی انسان قابل قدر ٹھہرے گا جو خدا کی نظر میں اس کا وفادار ثابت ہو۔ مگر مال کی محبت اس کو اندھا بنا دیتی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت کو جاننے سے محروم رہتا ہے جس کو وہ خود اپنے قریبی حالات میں تجربہ کر چکا ہے۔

105-243

عمل کا وزن

کھڑکھڑانے والی۔ کیا ہے کھڑاکھڑانے والی۔ اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ کھڑاکھڑانے والی۔ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوں گے۔ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔ پھر جس شخص کا پلہ بھاری ہوگا وہ دل پسند آرام میں ہوگا۔ اور جس شخص کا پلہ ہلکا ہوگا

تو اس کا ٹھکانا گڑھا ہے۔ اور تم کیا جانو کہ وہ کیا ہے، بھڑکتی ہوئی آگ (القارعۃ ۱۔۱۱)

قیامت کا بھونچال ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا۔ لوگوں کے تمام استحکامات درہم برہم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ایک نیا عالم بنے گا جہاں سارا وزن صرف حق میں ہوگا، بقیہ تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گے۔ موجودہ دنیا میں انسانوں کی پسند کا رواج ہے۔ یہاں انسانوں کی نسبت سے چیزوں کا وزن قائم ہوتا ہے۔ آخرت کی دنیا خدا کی دنیا ہے۔ وہاں خدا کی پسند کے اعتبار سے ایک چیز وزن دار ہوگی اور دوسری چیز بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔

دنیا میں اعمال کا وزن ظاہر کے اعتبار سے ہوتا ہے، آخرت میں اعمال کا وزن ان کی اندرونی حقیقت کے اعتبار سے ہوگا۔ جس آدمی کے عمل میں جتنا زیادہ اخلاص ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ وزنی قرار پائے گا۔ جو عمل اخلاص سے خالی ہو وہ آخرت میں بالکل بے وزن ہو کر رہ جائے گا۔ خواہ موجودہ دنیا میں ظاہر بینوں کو وہ کتنا ہی زیادہ باوزن دکھائی دیتا رہا ہو۔

102-244

دنیا کی دوڑ

بہتات کی حرص نے تم کو غفلت میں رکھا۔ یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ پھر ہرگز نہیں، تم بہت جلد جان لوگے۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔ پھر تم اس کو یقین کی آنکھ سے دیکھو گے۔ پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارہ میں پوچھ ہوگی۔ (التکاثر ۱۔۸)

آدمی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال کمائے۔ وہ زیادہ سے زیادہ سازوسامان اپنے پاس جمع کرے۔ وہ اسی دھن میں لگا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرنے کی چیز تو دوسری تھی اور میں کسی اور چیز کو جمع کرنے میں مصروف رہا۔ دنیا کی چیزوں کا اضافہ صرف آدمی کی مسئولیت کو بڑھاتا ہے۔ اور آدمی اپنی نادانی سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی کامیابی میں اضافہ کر رہا ہے۔ بلاشبہ اس سے بڑی بھول اور کوئی نہیں۔

103-245

زمانہ گواہ ہے

قسم ہے زمانہ کی۔ بے شک انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی (العصر ا۔ ۲)

آدمی ہر لمحہ اپنی موت کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی مہلت عمر کو استعمال نہ کرے تو آخر کار اس کے حصہ میں جو چیز آئے گی وہ صرف ہلاکت ہے۔ کامیاب ہونے کے لئے آدمی کو خود عمل کرنا ہے۔ جب کہ ناکامی کے لئے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ اس کی طرف بھاگی چلی آ رہی ہے۔

ایک بزرگ نے کہا کہ سورۂ عصر کا مطلب میں نے ایک برف بیچنے والے سے سمجھا جو بازار میں آواز لگا رہا تھا کہ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ لوگو، اس شخص پر رحم کرو جس کا اثاثہ گھل رہا ہے۔ اس پکار کو سن کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جس طرح برف پگھل کر کم ہوتی رہتی ہے اسی طرح انسان کو ملی ہوئی عمر بھی تیزی سے گزر رہی ہے۔ عمر کا موقع اگر بے عملی یا برے کاموں میں کھو دیا جائے تو یہی انسان کا گھاٹا ہے۔ (تفسیر کبیر امام رازی)

اپنے وقت کو صحیح استعمال کرنے والا وہ ہے جو موجودہ دنیا میں تین باتوں کا ثبوت دے۔ ایک، ایمان، یعنی حقیقت کا شعور اور اس کا اعتراف۔ دوسرے عمل صالح، یعنی وہی کرنا جو کرنا چاہئے اور وہ نہ کرنا جو نہیں کرنا چاہئے۔ تیسرے حق و صبر کی تلقین۔ یعنی حقیقت کا اتنا گہرا ادراک کی آدمی اس کا داعی اور مبلغ بن جائے۔

104-246

تباہی کا راستہ

تباہی ہے ہر طعنہ دینے والے، عیب نکالنے والے کی۔ جس نے مال کو سمیٹا اور گن گن کر رکھا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا۔ ہرگز نہیں۔ وہ پھینکا جائے گا

روندنے والی جگہ میں اور تم کیا جانو کہ وہ روندنے والی جگہ کیا ہے۔ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ جو دلوں تک پہنچے گی۔ وہ ان پر بند کردی جائے گی، اونچے اونچے ستونوں میں (الہمزہ ۱۔۹)

کسی سے اختلاف ہو تو آدمی اس کو دلیل سے رد کر سکتا ہے۔ مگر یہ درست نہیں کہ آدمی اس پر عیب لگائے۔ اس کو بدنام کرے۔ اس کو الزام تراشی کا نشانہ بنائے۔ پہلی بات جائز ہے مگر دوسری بات سراسر ناجائز۔

جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی دنیوی حیثیت محفوظ و مستحکم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے شخص پر بے بنیاد الزام لگانے سے ان کا اپنا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ مگر یہ صرف نادانی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا آگ کے گڑھے میں چھلانگ لگانا ہے۔ ایسا آگ کا گڑھا جس سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے لئے نہ ہوگی۔

105-247

ہاتھی والے

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا۔ کیا اس نے ان کی تدبیر کو اکارت نہیں کر دیا۔ اور ان پر چڑیاں بھیجیں جھنڈ کی جھنڈ۔ جو ان پر پتھر کی کنکریاں پھینکتے تھے۔ پھر اللہ نے ان کو کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔ (الفیل ۱۔۵)

ابرہہ چھٹی صدی عیسوی میں جنوبی عرب کا ایک مسیحی حبشی حکمراں تھا۔ اس نے مذہبی جنون کے تحت ۵۷۰ء میں مکہ پر حملہ کیا تا کہ کعبہ کو ڈھا کر ختم کر دے۔ اس کے ساتھ ساٹھ ہزار آدمیوں کا لشکر تھا جس میں تقریباً ایک درجن ہاتھی بھی شامل تھے۔ اسی بنا پر وہ لوگ اصحاب فیل (ہاتھی والے) کہے گئے۔ جب یہ لوگ مکہ کے قریب پہنچے تو ہاتھیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر یا۔ اسی کے ساتھ پرندوں کے جھنڈ آئے جن کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ انہوں نے یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر گرائیں تو سارا لشکر عجیب و غریب قسم کی بیماری میں مبتلا ہو گیا اور ہرا کر واپس بھاگا۔ مگر ابرہہ سمیت اس کے بیشتر افراد راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے۔

یہ واقعہ عین اس سال پیش آیا جس سال رسول اللہ ﷺ کی پیدائش ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مظاہرہ تھا کہ پیغمبر اسلام کو خصوصی غلبہ کی نسبت دی گئی ہے۔ آپ کے ساتھ یا آپ کے دین کے ساتھ جو بھی ٹکرائے گا وہ لازماً مغلوب ہو کر رہ جائے گا۔

106-248

قریش کی مثال

اس واسطے کہ قریش مانوس ہوئے، جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس۔ تو ان کو چاہئے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے ان کو امن دیا (قریش ۱۔۴)

قریش ایک تجارتی قوم تھے۔ گرمی کے زمانہ میں ان کے تجارتی قافلے شام اور فلسطین کی طرف جاتے تھے۔ اور سردیوں کے زمانہ میں وہ لمبے تجارتی سفر کرتے تھے۔ انہیں تجارتوں پر ان کی معاشیات کا انحصار تھا۔ قدیم زمانہ میں جب کہ تاجروں کو لوٹنا عام تھا، قریش کے قافلے راستہ میں لوٹے نہیں جاتے تھے۔ اس کی وجہ کعبہ سے ان کا تعلق تھا۔ قریش کعبہ کے خادم اور متولی تھے اور لوگوں کے ذہنوں پر چوں کہ کعبہ کا بہت زیادہ احترام تھا اس لئے وہ کعبہ کے خادموں اور متولیوں کا بھی احترام کرتے تھے اور اس بنا پر وہ ان کو لوٹتے نہ تھے۔

یہاں حکمت دعوت کے تحت قریش کو یہ واقعہ یاد دلاتے ہوئے انہیں اسلام کی طرف بلایا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ یہ بڑی ناشکری کی بات ہو گی کہ تم بیت اللہ کے دنیوی فائدے تو حاصل کرو، اور اس سے وابستہ ہونے کی جو دینی ذمہ داریاں ہیں ان کو پورا نہ کرو۔ جو خدا انسان کو مادی فائدے پہنچاتا ہے اسی خدا کی اس کو عبادت بھی کرنا چاہئے۔

107-249

آخرت سے بے خوفی

کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو انصاف کے دن کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں ابھارتا۔ پس تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لئے جو اپنی نماز سے

غافل ہیں۔ وہ جو دکھلاوا کرتے ہیں۔ اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی نہیں دیتے (الماعون ۱۔۷)
آخرت کی پکڑ کا یقین آدمی کو نیک عمل بناتا ہے۔ جس آدمی کے اندر آخرت کی پکڑ کا یقین نہ رہے وہ نیکی کی ہر بات سے خالی رہے گا۔ وہ اللہ کی عبادت گزاری سے غافل ہو جائے گا۔ وہ بے زور آدمی کو دھکا دینے میں بھی نہیں شرمائے گا۔ وہ غریبوں کے حقوق ادا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھے گا۔ حتی کہ وہ لوگوں کو ایسی چیز دینے کا بھی روادار نہ ہوگا جس کے دینے میں اس کا کوئی حقیقی نقصان نہیں، خواہ وہ دیا سلائی کی ایک ڈبیہ ہو یا کسی کے حق میں خیر خواہی کا ایک بول۔

108-250

بڑی کامیابی

ہم نے تم کو کوثر دے دیا۔ پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ بے شک تمہارا دشمن ہی بے نام و نشان ہے (الکوثر ۱۔۳)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے آمیز حق کی دعوت لے کر اٹھے تھے۔ اس قسم کا کام موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ چنانچہ آپ کو اس دعوت کی راہ میں اپنی ہر چیز کھودینی پڑی۔ آپ اپنی قوم سے کٹ گئے۔ آپ کی معاشی زندگی برباد ہو گئی۔ آپ کی اولاد کا مستقبل تاریک ہو گیا۔ تھوڑے لوگوں کے سوا کسی نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔ مگر انہیں حوصلہ شکن حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر اتری کہ تم کو ہم نے کوثر (خیر کثیر) دے دیا۔ یعنی ہر قسم کی اعلیٰ ترین کامیابی۔ قرآن کی یہ پیشین گوئی بعد کے سالوں میں کامل طور پر پوری ہوئی۔

یہی وعدہ درجہ بدرجہ پیغمبر اسلام کے امتیوں سے بھی ہے۔ ان کے لئے بھی "خیر کثیر" ہے۔ بشرطیکہ وہ اس خالص دین کو لے کر اٹھیں جس کو پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب لے کر اٹھے تھے۔ اس خیر کثیر کا تعلق دنیا سے لے کر آخرت تک ہے، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایک صالح مشن اگر اپنے ابتدائی مرحلہ میں کسمپرسی کی حالت میں ہو تو اس سے یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہمیشہ اسی حال میں رہے گا۔ صالح مشن کو ہمیشہ اللہ کی تائید ملتی ہے۔ آخر کار وہ کامیاب ہو کر

رہتا ہے، خواہ اپنے ابتدائی دور میں وہ بظاہر ناکام نظر آتا ہو۔

109-251

تکمیل دعوت

کہو کہ اے منکرو، میں ان کی عبادت نہیں کروں گا جن کی عبادت تم کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور میں ان کی عبادت کرنے والا نہیں جن کی عبادت تم نے کی ہے۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین (الکافرون ۱۔۶)

یہ سورہ مکہ کے آخری زمانہ میں اتری۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابتداءً ایک عرصہ تک "اے میری قوم" کے لفظ سے لوگوں کو پکارتے رہے۔ مگر جب اتمام حجت کے باوجود انہوں نے نہ مانا تو ان کو ایہا الکافرون (اے انکار کرنے والو) کے لفظ سے خطاب کیا گیا۔ اس مرحلہ میں یہ فقرہ دراصل کلمہ برأت ہے نہ کہ کلمۂ دعوت۔ یہ دعوت کے اسلوب کو نہیں بتاتا بلکہ صرف اس آخری اعلان کو بتاتا ہے جو داعی تکمیل دعوت کے بعد کرتا ہے۔

میرے لئے میرا دین، تمہارے لئے تمہارا دین —— یہ دوسروں کے دین کی تصدیق نہیں۔ یہ ایک طرف اپنے حق پر جمے رہنے کا آخری اظہار ہے۔ اور دوسری طرف وہ مخاطب کی اس حالت کا اعلان ہے کہ تم اب ضد کی اس آخری حد پر آگئے ہو جہاں سے کوئی شخص کبھی نہیں پلٹتا۔

110-252

خدا کی فتح

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح۔ اور تم دیکھو گے کہ لوگ خدا کے دین میں داخل ہو رہے ہیں فوج در فوج۔ تو اپنے رب کی تسبیح کرو اس کی حمد کے ساتھ اور اس سے بخشش مانگو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے (النصر ۱۔۳)

اللہ کی وہ مدد جس کا نام فتح ہے، وہ ہمیشہ دعوت کی راہ سے آتی ہے۔ لوگوں کا جوق در جوق دین

خدا کے دائرے میں داخل ہونا، یہی اللہ کی سب سے بڑی مدد ہے۔ اور اسی راہ سے اہل دین فتح و غلبہ کی منزل تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے آخری زمانہ (۹۔۱۰ھ) میں وہ حالات پیدا ہوئے جب کہ لوگ بہت بڑی تعداد میں خدا کے دین میں داخل ہو گئے۔ اور اس کے ذریعہ فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔

مومن کی فتح اس کے احساس عجز میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ اپنے بظاہر صحیح کام پر بھی خدا سے معافی مانگتا ہے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے ملنے والی کامیابی کو بھی خدا کے خانہ میں ڈال دیتا ہے۔

111-253

ایک کردار

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ برباد ہو جائے۔ نہ اس کا مال اس کے کام آیا اور نہ وہ جو اس نے کمایا۔ وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔ اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن لئے پھرتی ہے سر پر۔ اس کی گردن میں رسی ہے بٹی ہوئی (لہب ۱۔۵)

''ابولہب'' ایک اعتبار سے ایک شخص کا نام ہے، اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک مخصوص کردار ہے۔ ابولہب دعوت حق کی مخالفت کرنے والے اس انسان کی ایک تاریخی علامت ہے جو کمینہ پن کی حد تک اس کا دشمن بن جائے۔ اس کردار سے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ پیش آیا۔ اسی طرح آپ کی امت کے دوسرے داعیوں کو بھی اس سے سابقہ پیش آسکتا ہے۔ تاہم اگر داعی حقیقی معنوں میں اللہ کے لئے اٹھا ہے تو اللہ کی مدد اس کا ساتھ دے گی۔ ابولہب جیسے لوگوں کی معاندانہ کوششیں اللہ کی مدد سے بے اثر ہو جائیں گی۔ اپنے تمام ذرائع اور وسائل کے باوجود وہ برباد ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اپنے عناد میں خود جلے گا۔ وہ خدا کے داعی کو جس برے انجام تک پہنچانا چاہتا تھا وہیں وہ خود ابدی طور پر پہنچا دیا جائے گا۔

112-254

اخلاص

کہو وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی

اس کے برابر کا نہیں۔ (الاخلاص ا۔۴)

یہ سورہ توحید کی سورہ ہے۔ اس میں خدا کے تصور کو ان تمام آمیزشوں سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے جس میں ہر زمانہ کا انسان مبتلا رہا ہے ـــــ خدا کئی نہیں، خدا صرف ایک ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ وہ بذاتِ خود ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس سے بلند ہے کہ انسانوں کی طرح وہ کسی کی اولاد ہو یا اس کی کوئی اولاد ہو۔ وہ ایسی یکتا ذات ہے جس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی مثل اور برابر نہیں۔

113-255

اللہ کی پناہ مانگنا

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ ہر چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔ اور تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے۔ اور گرہوں میں پھونک مارنے والوں کے شر سے اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔ (الفلق ا۔۵)

اللہ وہ ہے جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے صبح کی روشنی نکالتا ہے۔ یہی خدا ایسا کر سکتا ہے کہ وہ آفتوں کے سیاہ بادل کو انسان سے ہٹائے اور اس کو عافیت کے اجالے میں لے آئے۔

موجودہ دنیا امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں خیر کے ساتھ شر بھی شامل ہے۔ اس لئے شر سے بچنے کے تدبیر صرف یہ ہے کہ آدمی اس کے مقابلہ میں اللہ کی پناہ حاصل کرے۔ یہ شر بہت قسم کے ہیں۔ مثلاً وہ شر جو بد باطن لوگ رات کی تاریکی میں کرتے ہیں۔ جادو کرنے والے لوگ جو اکثر گرہوں میں پھونک مار کر جادو کا عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر جلن میں مبتلا ہو جائیں اور اس کو اپنی حاسدانہ کارروائیوں کا شکار بنائیں۔ مومن کو ایسے تمام لوگوں سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ اور بلاشبہ اللہ ہی یہ طاقت رکھتا ہے کہ شر کی تمام قسموں سے انسان کو پناہ دے سکے۔

114-256

شیطان کا فتنہ

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب کی، لوگوں کے بادشاہ کی، لوگوں کے معبود کی۔ اس کے شر سے جو وسوسہ ڈالے اور چھپ جائے۔ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، جن میں سے اور انسان میں سے۔ (الناس ۱۔۶)

انسان ایک عاجز مخلوق ہے۔ اس کو لازمی طور پر پناہ کی ضرورت ہے۔ یہ پناہ اس کو ایک خدا کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ خدا ہی تمام انسانوں کا رب ہے، وہی لوگوں کا بادشاہ ہے، وہی لوگوں کا معبود ہے۔ پھر اس کے سوا کون ہے جو شر اور فتنہ کے مقابلہ میں لوگوں کا سہارا بنے۔

سب سے زیادہ خطرناک فتنہ جس سے انسان کو خدا کی پناہ مانگنی چاہئے وہ شیطان ہے۔ وہ سب سے زیادہ خطرناک اس لئے ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اصل حیثیت کو چھپاتا ہے۔ اور پر فریب تدبیروں سے انسان کو بہکاتا ہے۔ اس لئے شیطان کے فتنوں سے وہی شخص بچ سکتا ہے۔ جو بہت زیادہ باہوش ہو۔ جس کو اللہ نے وہ سمجھ دی ہو جس کے ذریعہ وہ حق اور ناحق میں تمیز کر سکے۔ وہ سمجھ سکے کہ کون سی بات حقیقی بات ہے اور کون سی بات وہ ہے جو حقیقی بات نہیں۔ یہ وسوسہ اندازی کرنے والے صرف معروف شیاطین ہی نہیں ہیں۔ انسانوں میں بھی ایسے شیطان نما لوگ ہیں جو مصنوعی روپ میں سامنے آتے ہیں اور پر فریب الفاظ کے ذریعہ آدمی کے ذہن کو پھیر کر اس کو گمراہی کے راستہ پر ڈال دیتے ہیں۔

فتنوں سے خدا کی پناہ مانگنا دو طرفہ عمل ہے۔ ایک طرف یہ خدا کی عنایت کو اپنے ساتھ شامل کرنا ہے۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد یہ ہے کہ فتنوں کے مقابلہ میں اپنے شعور کو بیدار کیا جائے تاکہ آدمی زیادہ باہوش طور پر اس کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔

تذکیر القرآن

رازِ حیات

کتابِ زندگی

پیغمبرِ انقلاب

قال اللہ و قال الرسول

مسائل اجتہاد

اللہ اکبر

دین و شریعت

تعمیر حیات

تعمیرِ انسانیت

مذہب اور جدید چیلنج

اسلام
ایک تعارف